تدبّر ۱

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن وحدیث

رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

قیمت تین روپے

مجلسِ ترتیب :

خالد مسعود (مدیر)

جاوید احمد

عبداللہ غلام احمد

ماجد خاور

ناشر: ادارۂ تدبرِ قرآن و حدیث

مطبع : المطبعۃ العربیہ پرانی انار کلی لاہور

تدبّر

سلسلہ نمبر ۴ — شعبان ۱۴۰۲ھ — جون ۱۹۸۲ء

فہرست مضامین

		صفحہ
تذکرہ و تبصرہ		
علم حدیث پر تحقیق کی ضرورت	خالد مسعود	۳
تدبر قرآن		
سورہ بقرہ (۴)	خالد مسعود	۷
فہم قرآن کے چند بنیادی اصول (۲)	امین احسن اصلاحی عبداللہ غلام احمد	۱۳
تدبر حدیث		
حدیث اور سنت میں فرق	امین احسن اصلاحی ماجد خاور	۱۷
موحدین کے گناہوں کی مغفرت	خالد مسعود	۲۵
تزکیہ نفس		
تعلق باللہ اور اس کی اساسات	امین احسن اصلاحی	۳۵
مراسلہ و مذاکرہ		
انسان کا امتحان اور مسئولیت	امین احسن اصلاحی	۴۴
رسولؐ وسیلہ ہیں	ماجد خاور	۴۶
غیر مسلم کی نیکی کا معاملہ		۴۷

تذکرہ و تبصرہ — بسم اللہ الرحمن الرحیم

خالد مسعود

علم حدیث پر تحقیق کی ضرورت

حدیث اور اس سے متعلق علوم امتِ مسلمہ کے لئے سرمایۂ افتخار ہیں۔ یہ اس بات پر شاہد ہیں کہ اس امت نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و اقوال کی تحقیق میں کس قدر جزرسی اور تن دہی سے کام لیا جس کے نتیجہ میں وہ آج بھی بڑے اعتماد اور جزم کے ساتھ یہ بتا سکتی ہے کہ آنحضرتؐ نے قرآن مجید کے مضمرات کو کس طرح کھولا، آپ کے معمولات کیا تھے، آپ کی پسند اور ناپسند کی باتیں کیا تھیں اور آپ نے لوگوں کو کس طرز زندگی کی تعلیم دی۔ امت مسلمہ کے سوا دوسرے مذاہب کے حاملین اپنے پیشواؤں کے احوال کے تحفظ کے لئے کسی ایسی کوشش کی نشاندہی اپنے ہاں نہیں کر سکتے۔

پچھلی چودہ صدیوں میں علم حدیث نے مختلف ادوار دیکھے ہیں۔ ایک زمانہ میں ہم نبی اکرمؐ کے جاں نثار صحابہ کو اس کوشش میں سرگرداں دیکھتے ہیں کہ وہ علم نبوی سے کسب فیض کی کسی شکل سے محروم نہ ہونے پائیں۔ بعض صحابہ تو سالوں اور مہینوں کے لئے شبانہ روز آپ کے ساتھ رہے تاکہ آپ کے طرز زندگی کا مشاہدہ کریں۔ جو مصروف تھے وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کے ساتھ باری مقرر کر کے آستانۂ عالیہ پر حاضر ہوتے تاکہ کسی اہم تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ ان کی یہ وابستگی محض اس لئے نہ تھی کہ وہ آنحضرتؐ کے بارے میں معلومات کا ذخیرہ کرنا چاہتے تھے بلکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ اپنے آپ کو علم و عمل کے اس سانچے میں ڈھال لے جس کو اللہ کے پیغمبر پسند فرماتے ہیں۔ صحابہؓ اپنی معلومات کا دوسرے ساتھیوں کے ساتھ تبادلہ کرنے میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے اس لئے اس پاکیزہ دور میں علم حدیث نہایت خالص شکل میں محفوظ ہوا اور پھیلا۔ اس کے مطابق مسلمانوں نے اپنی زندگیاں ڈھالیں اور وہ بعد والوں کے لئے نجوم ہدایت قرار پائے۔

جب اسلام عرب کے اطراف میں پھیل گیا اور نئے لوگ اس سے وابستہ ہونے لگے تو علم حدیث ایک نئے دور سے گزرا۔ نئے مسلمانوں کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش انہوں نے زمانۂ نبوت پایا ہوتا اور وہ آنحضرتؐ کی ایک ایک ادا کو اپنی زندگیوں میں سمو لیتے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہوتا کہ فلاں علاقے میں کوئی ایسے صاحب مقیم ہیں جنہیں آنحضرتؐ کو دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے

تو وہ ان سے ملاقات کے شوق میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے، سفر کی صعوبتیں اٹھا کر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال و اقوال کے بارے میں سوالات کر کے اپنی علمی پیاس بجھانے کا سامان کرتے۔ یہ وہ دور ہے جس میں علم حدیث کا چرچا ہوا۔ اس کے حاملین کی قدر افزائی ہوئی اور ہر اس شخص کو سر آنکھوں پر بٹھایا گیا جس کے بارے میں یہ معلوم ہوا کہ وہ علم نبوت کے کسی جز کا امین ہے۔

ایک خاص طرز فکر کو جب زیادہ اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور اس کے اپنانے والے قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں تو بعض لوگ اپنے ذاتی افکار کی ترویج کے لئے بھی اسی طرز فکر کا سہارا لے لیتے ہیں تاکہ لوگ ان کی بات پر اعتبار کریں اور ان کے خیالات کا سکہ بھی چل نکلے۔ چنانچہ علم حدیث کی طرف مسلمانوں کی اس توجہ کو دیکھتے ہوئے بعض فتنہ جو نا عاقبت اندیش لوگوں نے اپنے مزعومات و معتقدات کو حدیث کا قالب دینا شروع کیا۔ یہ فتنہ اتنی تیزی سے پھیلا کہ اس سے اصل علم حدیث زبردست خطرے سے دوچار ہو گیا اور امت کے زعما کے سامنے یہ مسئلہ آ گیا کہ فتنہ جوؤں کی دستبرد سے حدیث کو کیسے بچایا جائے۔ چنانچہ ائمہ محدثین نے خبر کی تحقیق کے لئے علوم و فنون وضع کئے اور معاشرے میں رواج پانے والی ایک ایک روایت کو جانچا اور پرکھا۔ انہوں نے راویوں میں مخلص اور غیر مخلص، ثقہ اور غیر ثقہ کے مابین امتیاز کرنے کی کوشش کی۔ اکابر محدثین نے اپنی اپنی تحقیقات پر مبنی ان روایات کے مجموعے تیار کئے جو ان کے بنائے ہوئے معیارِ صحت پر پوری اترتی تھیں۔ یہ دور حدیث کی تدوین کا دور ہے اور اس دور کی یادگار وہ کتب حدیث ہیں جو صدیوں سے امت میں متداول چلی آ رہی ہیں اور حدیث کا بیشتر قابل اعتماد ذخیرہ انہی میں محفوظ ہے۔

یہ حقیقت اہل علم سے پوشیدہ نہیں کہ حدیث کی ان تمام مصنفات کا معیار تحقیق ایک جیسا نہیں۔ نیز ایک روایت کی صحت کو جانچنے کے لئے اس کی سند کو واحد کسوٹی قرار دیا گیا ہے۔ متن حدیث پر بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ حدیث کی امہات کتب کی تدوین کے بعد بھی صحت روایت کو دوسری کسوٹیوں پر پرکھنے کے سلسلہ میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی بلکہ علمائے حدیث کا پسندیدہ شغلہ انہی کتب کی شرحیں لکھنے اور ان میں سے اپنے ذوق کی روایات کے منتخب مجموعے ترتیب کرنے تک محدود رہا ہے۔

تحقیق حدیث کے میدان میں اس جمود کا نتیجہ یہ نکلا کہ حدیث صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع کے اصطلاحی معانی تو گم ہو گئے اور عامۃ المسلمین میں یہ تصور پھیل گیا کہ جو خبر حدثنا اور اخبرنا کے

الفاظ کے ساتھ بیان ہوتی ہے اس کی نسبت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحیح ہوتی ہے اور اس کے بارے میں کلام کرنا گویا آنحضرتؐ کے مرتبہ و مقام کے انکار کے مترادف ہے۔ اس عامیانہ تصور سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے واعظین نے ضعیف اور موضوع روایتوں سے اپنے وعظوں کو آراستہ کر کے عوام کو دین کے اصل حقائق سے بے بہرہ کرنے کی راہ ہموار کر دی۔ مجمل روایات کی روشنی میں ایسے عقائد لوگوں میں پھیلا دیئے گئے جو قرآن کی محکمات سے بھی ٹکراتے تھے حالانکہ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ حدیث کا فہم اس سے بھی زیادہ محنت چاہتا ہے جتنی محنت قرآن فہمی کے لئے درکار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے محکمات محفوظ ہیں اور ان کی صحت و ترتیب ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر کلمہ جس سیاق و سباق میں استعمال ہوا ہے وہ معلوم و متعین ہے۔ اس کے برعکس روایت حدیث میں بہرحال بہت سے راویوں کے علم، فہم، حافظہ اور امانت پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ روایت بالعموم راوی کے اپنے الفاظ میں ہوتی ہے، کلام کا موقع و محل واضح نہیں ہوتا اور مختلف واسطوں سے آنے کے باعث بات کا انداز و اسلوب بدل بدل جاتا ہے۔

روایت حدیث کی ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے ہمارے زمانے میں منکرین حدیث نے امت میں ایک نیا فتنہ برپا کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے حدیث کو عجمی سازش قرار دے کر سرے سے اس علم کو ناقابل اعتماد قرار دے دیا۔ یہ موقف وہی شخص اختیار کر سکتا ہے جو امت کے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کرنا چاہتا ہو اور یہ سمجھتا ہو کہ علم نبوت کا یہ سرمایہ اس کی آزادی پر بے جا پابندیاں عائد کرتا ہے۔ منکرین حدیث نے ادھر ادھر سے بعض روایات کو موضوع سخن بنا کر اپنے موقف کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن کسی واقعی علمی تحقیق کے نتیجے میں وہ ذخیرہ حدیث کو ناقابل استناد ثابت نہیں کر سکے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ انکار حدیث کے اصل عوامل کچھ دوسرے ہیں۔ اس کا واقعی علمی سبب موجود نہیں۔ کسی درجے میں اگر کوئی چیز اس کا سبب بنی ہے تو وہ تحقیق حدیث کے سلسلہ کا وہ جمود ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا۔

ہمارے نزدیک اس زمانہ کی ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ علم حدیث پر تحقیق کی جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے اس موضوع سے متعلق بنیادی تصورات کو درست کرنے کی ضرورت ہے جن کا تصور واضح نہ ہونے کی وجہ سے لوگ بات کا محل تک بدل دیتے اور نتائج کے اخذ کرنے میں غلطی کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد حدیث پر تدبر کے اصول قائم کرنے کی ضرورت ہے جن سے روایت کے غث و سمین میں امتیاز کرنے، اس کے مجمل کو کھولنے اور سیاق کلام کو سمجھنے میں مدد ملے۔ ان اصولوں

کی روشنی میں اگر حدیث پر تدبر کیا جائے تو اس ذخیرہ علم سے واقعی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ ادارہ تدبر قرآن و حدیث پر اس کام کی اہمیت واضح ہے اور وہ اسے پیش نظر رکھے ہوتے ہے۔ ادارہ کے زیر اہتمام ہونے والے درس حدیث میں مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ' نے تدبر حدیث کے اصول پر متعدد لیکچر دیئے جن کو ٹیپ کر لیا گیا تھا۔ ہمارے رفیق ماجد خاور صاحب نے اس سلسلہ کا پہلا لیکچر 'حدیث اور سنت میں فرق'، مرتب کر دیا ہے جو شامل اشاعت ہے۔ باقی لیکچر ان شاء اللہ تدریجاً آئندہ شماروں میں شائع کئے جائیں گے تاکہ جو لوگ تحقیق حدیث کے موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ان سے مستفید ہو سکیں۔ اسی سلسلہ کی ایک حقیر کوشش حدیث کی وہ وضاحت ہے جو ہر شمارہ میں راقم کے قلم سے شائع ہوتی ہے۔

بقیہ: حدیث اور سنت میں فرق

کے اہتمام کے ساتھ اگر فعل کی ظاہری شکل و صورت میں کچھ اختلاف ہو جائے تو اس سے فعل، سنت کے دائرہ سے خارج نہیں ہو جاتا۔

تشہد سے متعلق جو روایات ہیں وہ سب فقیہ صحابہؓ سے مروی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کے الفاظ ایک دوسرے سے کچھ مختلف ہیں، لیکن مغز اور روح سب میں ایک ہی ہے۔ اب فرض کیجیے کہ ایک شخص ان میں سے اس تشہد کو اختیار کرتا ہے جو حضرت عمرؓ یا حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے اس تشہد کو نہیں اختیار کرتا جو حضرت عائشہؓ یا حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے تو کیا یہ کہنا جائز ہو گا کہ اس کا یہ فعل سنت کے خلاف ہے؟ علمی بنیاد پر ان میں راجح اور مرجوح کی بحث تو ہو سکتی ہے لیکن ان میں سے کسی کو سنت سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے؟

ہمارے نزدیک یہی صورت آمین بالجہر اور آمین بالسر کی اور ہاتھ باندھ کر یا ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھنے کی بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے سنت ہونے کے امکانات و قرائن، بلکہ دلائل موجود ہیں۔ بعض محرکات کی بنا پر، جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے، ان میں سے بعض کو بعض مقامات میں زیادہ فروغ ہوا بعض کو کم ہوا، لیکن ان میں سے کسی کو بھی سنت سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ آپ ان میں سے کسی کے مؤکدہ یا غیر مؤکدہ ہونے کی بحث اٹھا سکتے ہیں، لیکن ان کے سنت ہونے سے انکار کی گنجائش کسی طرح بھی نہیں نکل سکتی۔

(ترتیب: ماجد خاور)

تدبر قرآن

خالد مسعود

سورۃ بقرہ (۴)

کہہ دو کہ جو جبریل کا مخالف ہوا[115] تو وہ جان لے کہ جبریل نے اس کلام کو تمہارے دل پر اللہ تعالیٰ کے حکم سے اتارا ہے[116]۔ مطابق ان پیشین گوئیوں کے جو اس کے پہلے سے موجود ہیں اور یہ ہدایت و بشارت ہے اہل ایمان کے لئے۔ جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے[117]۔ ۹۸

اور ہم نے تمہارے اوپر نہایت واضح دلیلیں[118] اتاری ہیں۔ ان کا انکار صرف عہد شکن ہی لوگ کر سکتے ہیں۔ کیا ان کی یہی روش قائم رہے گی کہ جب کوئی عہد کریں گے تو ان کا ایک گروہ اس کو اٹھا پھینکے گا، بلکہ ان میں سے اکثر ایمان سے عاری ہیں[119]۔ ۱۰۰

اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے ایک رسولؐ ان پیشین گوئیوں کے مطابق[120] آیا جو ان کے پاس موجود ہیں تو ان لوگوں نے جن کو کتاب دی گئی تھی، اللہ کی کتاب کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینکا گویا اس سے آشنا ہی نہیں۔

---

[115] معلوم ہوتا ہے کہ یہود قرآن اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضد میں جبریل علیہ السلام کو بھی اپنا مخالف ظاہر کرنے لگے تھے اور انہوں نے یہ شغل چھوڑا کہ یہ فرشتہ ہمارا دیرینہ مخالف ہے۔ اس وجہ سے ہم کسی ایسے شخص پر ایمان نہیں لا سکتے جس کی ہمارے مخالف فرشتے سے ساز باز ہے۔

[116] یعنی فرشتے کوئی کام خدا کے حکم کے بغیر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا تم تنہا جبریلؑ ہی کے نہیں بلکہ خدا کے بھی مخالف ہوئے۔

[117] چونکہ خدا اور اس کے فرشتوں اور رسولوں میں کامل ہم آہنگی ہے اس لئے جو شخص ان میں سے کسی ایک کا بھی مخالف ہوا وہ سب کا مخالف ہوا۔ ایسے لوگ کافر اور اللہ ان کا دشمن ہے۔

[118] آیات بینات سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی وہ واضح دلیلیں ہیں جو آپ پر نازل ہوئیں۔ عام اس سے کہ وہ قرآن کے مدلل بیانات کی صورت میں ہیں یا ان کارناموں، علامات، شواہد، اور معجزات کی شکل میں جو آپ کے ذریعہ سے ظہور میں آئے۔

[119] یعنی یہ تورات پر ایمان کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت ایمان اس پر بھی نہیں رکھتے۔

[120] یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم

اوران چیزوں کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمانؑ کے عہد حکومت میں شیاطین پڑھتے پڑھاتے تھے[۱۲۱]۔ حالانکہ سلیمانؑ نے کوئی کفر نہیں کیا[۱۲۲]۔ بلکہ شیطانوں ہی نے کفر کیا۔ یہی لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔
اور اس چیز میں پڑ گئے جو بابل میں دو فرشتوں — ہاروت اور ماروت پر اتاری گئی تھی۔ حالانکہ یہ کسی کو سکھاتے نہیں تھے جب تک اس کو خبردار نہ کر دیں کہ ہم آزمائش کے لئے ہیں تو تم کفر میں نہ پڑنا[۱۲۳]۔ پس یہ لوگ ان سے وہ علم سیکھتے جس سے میاں اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں[۱۲۴]۔ حالانکہ یہ اس کے ذریعہ سے خدا کی مشیت کے بغیر کسی کو نقصان پہنچانے والے نہیں بن سکتے تھے[۱۲۵]۔ اور یہ وہ چیز سیکھتے تھے جو ان کو نقصان پہنچائے نفع نہ پہنچائے۔ حالانکہ ان کو پتہ تھا کہ جس نے اس چیز کو اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے کیا ہی بری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں انہوں نے اپنی جانوں کو بیچا۔ اے کاش وہ اس کو سمجھتے ۔۱۰۲
اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو اللہ کا ثواب ان کے لئے کہیں بہتر تھا۔ کاش وہ سمجھتے[۱۲۶] ۔۱۰۳

---

[۱۲۱] ان ظالموں نے کتاب الٰہی کو تو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور سحر و شعبدہ اور علم نجوم وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کو جو سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں جنوں اور ان کی پیروی کرنے والے انسانوں کے باہمی اشتراک سے رواج پا گئے اس کی جگہ اختیار کر لیا۔

[۱۲۲] حضرت سلیمانؑ کا دامن ان علوم سفلیہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہے انہوں نے اس کفر کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔

[۱۲۳] اس سے مراد اشیا اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کا وہ علم ہے جس کو یہود نے گنڈوں، تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لئے استعمال کیا۔ اس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا۔ لیکن نتائج پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زود اثر تھا۔
اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتیں دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس لئے فرشتوں نے خبردار کر دیا کہ کوئی شخص اس علم کو سیکھ کر اس کو برے مقاصد میں استعمال کرے۔ ورنہ اس طرح وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

[۱۲۴] اس آیت سے یہود کے فساد اخلاق اور ان کی پست ہمتی اور رذالت پر روشنی پڑتی ہے کہ وہ اس علم کو میاں بیوی کے رشتہ محبت کو قطع کرنے کے لئے بطور مقراض استعمال کرتے۔

[۱۲۵] اعمال شیطانیہ ہوں یا اعمال روحانیہ، ان سے اگر کسی کو نفع یا ضرر پہنچتا یا پہنچایا جا سکتا ہے تو صرف اللہ کے اذن اور اس کی مشیت کے تحت۔ یہ چیزیں بذات خود مؤثر نہیں ہیں۔

[۱۲۶] یعنی اصل اجر و ثواب اللہ کی کتاب پر ایمان اور تقویٰ کا ہے۔ علوم سفلیہ کی دکان داری میں کچھ نہیں رکھا ہے۔

اے ایمان والو تم "راعنا"[۱۲۷] نہ کہا کرو "انظرنا"[۱۲۸] کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو۔ کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے ۔۱۰۴ جن لوگوں نے کفر کیا، اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے کوئی راحت نازل ہو۔ اور اللہ اپنی رحمت کے لئے خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے ۔۱۰۵
جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں[۱۲۹]۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔۱۰۶ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی کے لئے ہے اور تمہارے لئے اللہ ہی کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار[۱۳۰] ۔۱۰۷
کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح سوال کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کئے گئے۔ اور جو لوگ ایمان سے کفر بدل لیں گے تو وہ شاہراہ سے بھٹک گئے[۱۳۱] ۔۱۰۸
بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمہارے ایمان کے بعد پھر تمہیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں،

---

[۱۲۷] اب مسلمانوں کو یہود کی ان شرارتوں سے آگاہ کیا جا رہا ہے جو وہ بنی اسماعیل کو قرآن اور پیغمبرؐ پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم کرنے کے لئے کر رہے تھے۔

[۱۲۸] اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو تو متکلم کو پھر متوجہ کرنے کے لئے عربی میں "راعنا" کا لفظ ہے یعنی ذرا ہمارا لحاظ فرمائیے۔ اسی موقع و محل کے لئے "انظرنا" کا لفظ بھی ہے۔ یہود "راعنا" کا لفظ اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ذرا سا زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو پیدا کیا جا سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس لفظ ہی کو مسلمانوں کے مجلسی الفاظ سے خارج کر دیا۔

[۱۲۹] یہود مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے تھے کہ جب قرآن حضرت موسیٰؑ کو خدا کا پیغمبر اور تورات کو خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو پھر تورات کے احکام کے ردّ و بدل کے کیا معنی؟ قرآن نے یہ ان کا جواب دیا ہے کہ اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک تو خوب سے خوب تر کی طرف بڑھا رہا ہے۔ دوسرے دین کی جو دولت ضائع کر دی گئی تھی اس کی جگہ دین کے خزانہ کو نئی دولت سے معمور کر رہا ہے۔

[۱۳۰] اس آیت میں یہود کی منصب امامت سے معزولی اور ان کی جگہ دوسری امت کے نصب و تقرر کا پیغام مضمر ہے۔

[۱۳۱] سوال بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے۔ یہاں کمزور مسلمانوں کو تنبیہ کی کہ یہود کے القا کئے ہوئے یہ سوالات اپنی ذہنیت اور نوعیت کے اعتبار سے اسی طرح کے سوالات ہیں جس طرح کے سوالات یہود حضرت موسیٰؑ سے کرتے رہے ہیں اور یہ روش ایمان کو کفر سے بدلنے کی روش ہے۔

محض اپنی طرف سے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہوجانے کے باوجود، تو درگزر کرو اور نظر انداز کرو۔ یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔[۱۳۲] اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لئے کرو گے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے۔[۱۳۳] جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے ۝۱۱۰

اور کہتے ہیں کہ جنت میں داخل نہیں ہوسکتے، مگر وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو ۝ ہاں بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کردیا اور وہ ٹھیک ٹھیک طرح سے عمل کرنے والا ہے تو اس کے لئے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے۔[۱۳۴] ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۝ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کی کوئی بنیاد نہیں اور یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔[۱۳۵] اسی طرح کی بات ان لوگوں نے بھی کہی جن کو علم نہیں ہے۔[۱۳۶] تو اللہ قیامت کے دن اس معاملہ کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے ہیں ۝۱۱۲

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مساجد کو اس بات سے محروم کریں کہ ان میں اس کا ذکر کیا جائے اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔[۱۳۷] ان کے لئے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے، ان کے

---

۱۳۲ یعنی ابھی یہود کی ان شرارتوں کو نظر انداز کرو یہاں تک اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اس وعید کے اندر وہ ساری باتیں چھپی ہوئی ہیں، جو بعد میں یہود کے ساتھ جنگ کے حکم، ان کی ہزیمت، قتل و جلاوطنی اور ادائے جزیہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

۱۳۳ یہ مسلمانوں کو معاندینِ اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا ہے۔ نماز اور زکوٰۃ تمام دین کی بنیاد، تمام تربیتِ اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ ہیں۔

۱۳۴ یعنی مستحقِ جنت ہونے کے لئے شرط یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالے کردے۔ اس کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق کئے بغیر اپنی پوری زندگی کو اس کی شریعت کے تابع کردے اور شریعت کے احکام کی تعمیل پورے خلوص، پوری دیانت اور کامل راست بازی کے ساتھ کرے۔

۱۳۵ یعنی یہود اور نصاریٰ تورات کی پیروی کے مدعی ہونے کے باوجود ایک دوسرے کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے۔ ان کا گٹھ جوڑ نہ تو دین کے تحفظ کے لئے ہے، نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے۔ محض اسلام دشمنی کے جذبہ نے ان کو متحد کردیا ہے۔

۱۳۶ اس سے مراد مشرکین بنی اسماعیل ہیں، جو کتاب و شریعت سے ناآشنا اُمّی تھے۔

۱۳۷ یعنی ان مدعیانِ جنت نے باہمی عناد و عداوت کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو تباہ و برباد کیا۔ یہود

لئے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔[۱۳۸] اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے۔[۱۳۹] اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے ۝۱۱۵

اور کہتے ہیں خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے۔ بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔[۱۴۰] ۝ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کرلیتا ہے تو بس اس کے لئے فرما دیتا ہے کہ ہوجا تو وہ ہوجاتا ہے۔[۱۴۱] ۝۱۱۶

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہمکلام کیوں نہیں ہوتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟[۱۴۲] اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں۔ انھوں نے بھی انہی کی طرح کی بات کہی۔ ان سب کے دل ایک ہی جیسے ہوگئے۔[۱۴۳] جو لوگ یقین کرنے والے ہیں، ان کے لئے ہم نشانیاں اچھی طرح واضح کرچکے ہیں ۝ ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کے بارے

نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو ذکر و عبادت سے روکنے کے لئے خون ریز جنگیں ہوچکی ہیں اور اس سے باہر بھی۔ نصاریٰ نے لوگوں کو بیت اللہ کے حج سے روکنے کے لئے مکہ پر چڑھائی کردی۔

۱۳۸ اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو ڈرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے داخل ہو۔ یہ مقام ان لوگوں کے لئے قابلِ غور ہے جو محض گروہی تعصبات کے تحت اپنے سے مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں۔

۱۳۹ یہود و نصاریٰ میں وجہِ نزاع یہ بھی تھی کہ نصاریٰ نے سمتِ مشرق کو قبلہ بنا لیا اور یہود نے مغرب کو۔ اس سبب اختلاف کی لغویت کی طرف اشارہ کیا ہے فرمایا کہ وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رخ کرتے، خدا ہی کی طرف رُخ کرتے۔

۱۴۰ یہود عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ مسیحؑ کو اور مشرکینِ عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے، فرمایا خدا اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک ہے، کوئی چیز کسی پہلو سے بھی اس کی ذات، صفات یا اس کے حقوق میں شریک و سہیم نہیں ہے۔

۱۴۱ یعنی خدا شرکاء و معاونین سے بالکل بے نیاز اور مستغنی ہے۔ ایسی قادرِ مطلق ہستی کیساتھ آلِ اولاد کا کیا جوڑ؟

۱۴۲ یہ مشرکین بنی اسماعیل کا قول ہے نشانی سے مراد ایک محسوس معجزہ ہے۔

۱۴۳ یعنی قساوت، طغیان، حق دشمنی کی جو سیاہی ان کے دلوں پر چھا چکی تھی وہی سیاہی ان کے دلوں پر بھی چھا رہی ہے۔

میں کوئی پرسش نہیں ہوگی۔[۱۴۴] ۱۱۹

نہ یہود تم سے راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ تاوقتیکہ تم انہی کی ملت کے پیرو کار نہ بن جاؤ۔ ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس علم حقیقی کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمہارا کوئی دوست ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔[۱۴۵] ۱۲۰

جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں، وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے۔[۱۴۶] اور جو اس کا انکار کریں گے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۱۲۱

---

۱۴۴ یعنی ان کی خواہشات کے مطابق نشانیاں دکھانا تمہاری ذمہ داری نہیں ہے، تم سے جو کچھ پرسش ہوگی تمہارے فرضِ رسالت کے بارے میں ہوگی۔

۱۴۵ خدا کی طرف سے ہدایت آجانے کے بعد کسی اور طریقہ پر جمے رہ جانا اپنی خواہشات کی پیروی ہے اس لئے یہاں یہود و نصاریٰ کے طریقوں کو خواہشات سے تعبیر فرمایا ہے۔ یہاں خطاب بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو تنبیہ اور عتاب ہے اس کا رُخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

۱۴۶ یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کا حق صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے ہیں وہی اس ہدی اللہ پر ایمان لائیں گے جو پیغمبر ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں میں برکت انہی کو عطا فرماتا ہے جو ان کی قدر کرتے ہیں۔

امین احسن اصلاحی

فہم قرآن کے لئے چند بنیادی اصول (۳)

۳- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لئے کسوٹی ہے تیسرا اصول جو قرآن پر تدبر کرتے ہوئے پیش نظر رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کو حق و باطل میں امتیاز کے لئے کسوٹی کی حیثیت حاصل ہے اس وجہ سے کوئی ایسی چیز جو قرآن مجید کے خلاف ہو قبول نہیں کی جائے گی۔ ارشاد ہے:-

وَاَنۡزَلۡنَاۤ اِلَيۡكَ الۡكِتٰبَ بِالۡحَـقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيۡنَ يَدَيۡهِ مِنَ الۡكِتٰبِ وَمُهَيۡمِنًا عَلَيۡهِ فَاحۡكُمۡ بَيۡنَهُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَهُمۡ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الۡحَـقِّ‌ؕ ......

(المائدة - ۴۸)

اور ہم نے تمہاری طرف کتاب اتاری حق کے ساتھ، تصدیق کرتی ہوئی اس سے پیشتر سے موجود کتاب کی اور اس کے لئے کسوٹی بنا کر، تو ان کے درمیان فیصلہ کرو اس کے مطابق جو اللہ نے اتارا اور اس حق سے ہٹ کر جو تمہارے پاس آچکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو.....

'مہیمن' اصل میں 'مأامن' ہے پہلا ہمزہ 'ی' سے اور دوسرا 'ہ' سے بدل گیا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی صفت کے طور پر بھی استعمال ہوا ہے مثلاً سورۃ حشر آیۃ ۲۳ میں اور قرآن مجید کی صفت کے طور پر بھی جیسا کہ سورۃ مائدۃ کی مذکورہ آیت میں۔ 'ھیمن الطائر علی فراخہ' کا مطلب یہ ہوگا کہ پرندہ اپنے بچوں کے اوپر پر پھیلائے ہوئے منڈلا رہا ہے گویا ان کو اپنی حفاظت میں لئے ہوئے ہے۔ 'ھیمن فلان علی کذا' کے معنی ہیں کہ فلاں اس چیز کا محافظ اور نگران بن گیا۔ سابق صحیفوں پر قرآن مجید کے مہیمن ہونے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن مجید کتاب الٰہی کا اصل معتمد نسخہ ہے اس لئے وہ دوسرے صحیفوں کے حق و باطل میں امتیاز کے لئے کسوٹی ہے۔ جو بات اس پر کھری ثابت ہوگی وہ کھری ہے اور جو بات اس پر پوری نہیں اترے گی وہ محرف ہے۔ مذکورہ آیۂ کریمہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے یہ کتاب اتاری ہے جو تمام اختلافات کے درمیان قول فیصل اور سابق صحیفوں کے لئے معیار اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے تو اب تم ہر معاملے کا فیصلہ اسی کی روشنی میں کرو۔ اس سے ہٹ کر ان منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی ہرگز پیروی نہ کرنا جو اپنی خواہشوں کے مطابق فیصلہ کرانے کے لئے تمہارے پاس آتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو اتارا ہی اس لئے

ہے کردہ سابق صحیفوں کے لئے کسوٹی کا کام دے۔ قدیم صحیفے — توریت، انجیل، زبور وغیرہ — بھی اللہ تعالیٰ ہی کے نازل کردہ ہیں لیکن قرآن کے بعد اب یہ اسی حد تک مانے جائیں گے جس حد تک ان میں اور قرآن مجید میں موافقت ہے۔ جہاں قرآن مجید میں اور ان صحیفوں کے بیان میں مخالفت ہوگی وہاں قرآن مجید کا بیان ہی مانا جائے گا۔

قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ بلند درجہ حدیث شریف کا ہے۔ جہاں تک ان حدیثوں کا تعلق ہے جن پر امت کا بھی تواتر ہے وہ تو قرآن ہی کی طرح قطعی ہیں لیکن اخبار احاد میں بعض شبہات پیدا ہوسکتے ہیں اس وجہ سے ان میں سے وہی قبول کی جائیں گی جو قرآن سے متصادم نہ ہوں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ بات معلوم ہے کہ آپ نے کوئی بات نہ قرآن کے خلاف فرمائی نہ فرما سکتے تھے۔ قرآن میں نہایت واضح الفاظ میں تصریح ہے کہ قریش نے جب یہ مطالبہ کیا کہ آپ یا تو اس قرآن میں ترمیم کریں یا اس کی جگہ کوئی اور قرآن لائیں تب ہم مانیں گے۔ اس کے بغیر ہم کسی طرح بھی قرآن مجید کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کو یہ جواب دلایا:

قُلْ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ أُبَدِّلَهُۥ مِن تِلْقَآئِ نَفْسِيٓ ۖ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰٓ إِلَيَّ ۖ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝

(یونس - ۱۵)

کہہ دو مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کردوں۔ میں تو صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر آتی ہے اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کی تو ایک ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

یعنی یہ میری کوئی اپنی تصنیف تھوڑے ہی ہے کہ میں اس میں اپنی طرف کوئی ترمیم وتنسیخ کردوں۔ یہ کلام تو مجھ پر خدا کی طرف سے وحی ہوتا ہے۔ میں بے چوں وچرا اس کو پیش کرتا ہوں میرا یہ منصب نہیں کہ اس میں ردو بدل کردوں۔ اگر ایسا کردوں تو کل کو خدا کے آگے کیا جواب دوں گا۔ معلوم ہوا کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اختیار ہی حاصل نہیں کہ وہ قرآن مجید میں کوئی ادنیٰ ترمیم کرسکیں تو آپ کا کوئی قول وفعل قرآن مجید کے خلاف نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کا قول یا عمل قرآن کے خلاف نظر آئے جس کی کوئی توجیہ یا تطبیق نہ ہوسکے تو لازماً اس کے مقابل میں قرآن کو ترجیح دی جائے گی اس لئے کہ وہ کسوٹی ہے۔

بعض غالی لوگ حدیث کو قرآن پر حاکم مانتے ہیں۔ امام احمد بن حنبلؒ سے جب اس کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ ”میں یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ حدیث قرآن پر حاکم ہے البتہ حدیث تو قرآن کی مفسر اور اس کو واضح کرنے والی ہے۔“ امام صاحب نہ صرف بہت بڑے امام حدیث ہیں بلکہ اس

فن شریف کے معاملہ میں ان کو صاحب الثبت کا مقام حاصل ہے۔ جب ان کی رائے حدیث کے بارے میں یہ ہے تو کسی دوسرے کی رائے کو کیا وقعت دی جاسکتی ہے۔

امام صاحب کی یہ رائے نہایت حکیمانہ اور قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن مجید میں نبی صلی علیہ وسلم کو ’معلم کتاب‘ کہا گیا ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝

(آل عمران - ۱۶۴)

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا کہ انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے معلم ہیں تو ان سے بڑا قرآن کی تفسیر کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی جس طرح تفسیر فرمائی ہے اگرچہ احادیث میں اس کا بڑا ذخیرہ موجود ہے لیکن یہاں زیادہ تفصیل میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔ صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں تاکہ آپ کو کچھ اندازہ ہوسکے کہ حدیث کے تفسیرِ قرآن ہونے کا مدعا کیا ہے۔

بخاری شریف میں روایت ہے:

عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال جاء رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ من احق لحسن صحابتی قال امك، قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من؟ قال امك، قال ثم من؟ قال ثم ابوك۔

(بخاری۔ کتاب الادب)

ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوکر پوچھا: ”یا رسول اللہ میرے حسنِ سلوک کا سب سے زیادہ حق دار کون ہے؟“ فرمایا: ”تمہاری ماں“، بولا: ”پھر کون؟“ فرمایا: ”تمہاری ماں“ بولا: ”پھر کون؟“ فرمایا: ”تمہاری ماں“ بولا: ”پھر کون؟“ فرمایا: ”پھر تمہارا باپ“

قرآن مجید میں اس مضمون کو دیکھئے تو والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ وَهْنًا عَلَىٰ وَهْنٍ وَفِصَالُهُ فِي عَامَيْنِ أَنِ اشْكُرْ لِي وَلِوَالِدَيْكَ إِلَيَّ الْمَصِيرُ ۝

اور ہم نے انسان کو اس کے والدین کے معاملے میں نیک سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اس کو پیٹ میں رکھا اور دو

(لقمٰن - ۱۴)

وَوَصَّيْنَا الْإِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا ؕ حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ؕ وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا ؕ

(الاحقاف - ۱۵)

سال کا دودھ چھڑانا ہوا کہ میرے شکر گزار رہو اور اپنے والدین کے میری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔

ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کی ہدایت کی۔ اس کی ماں نے دکھ کے ساتھ اس کو پیٹ میں رکھا اور دکھ کے ساتھ اس کو جنا۔ اور اس کو پیٹ میں رکھنا اور اس کو دودھ چھڑانا تیس مہینوں میں ہوا۔

ان آیات میں یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ جہاں تک شکرگزاری اور خدمت کا تعلق ہے اس کا حکم تو باپ اور ماں دونوں کے لئے ہے لیکن قربانیاں صرف ماں ہی کی گنائی گئی ہیں۔ باپ کی کسی قربانی کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان آیات میں حمل، ولادت، اور رضاعت تینوں مراحل کی طرف اشارہ ہے اور ان تینوں کٹھن مراحل کا تعلق صرف ماں ہی سے ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف نے، جو قرآن مجید کی تفسیر ہے، ماں کا حق باپ سے تین درجہ زیادہ گنایا ہے۔ قرآن مجید میں بات ایک الگ اسلوب سے بیان ہوئی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بات کو ایک دوسرے اسلوب سے واضح فرما دیا ہے۔ حقیقت دونوں جگہ ایک ہی ہے لیکن حدیث نے قرآن کے حکیمانہ اسلوب کی وضاحت فرما دی ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم احادیث میں جو تفسیر بیان فرماتے ہیں اس کو سمجھنے کے لئے غور و تامل کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ اس میں حکمت کے وہ دقیق نکتے بھی آتے ہیں جن تک ہر شخص کی رسائی نہیں ہو سکتی لیکن ایک بات قطعی ہے کہ جس طرح مفسر کو یہ بتانا پڑتا ہے کہ کوئی نکتہ اس نے قرآن مجید کی کس آیت اور اس کے کس لفظ سے لیا ہے اسی طریقہ سے جو کچھ احادیث میں ہوگا اس کے لئے بھی کوئی نہ کوئی اشارہ، قرینہ یا لفظ متعلقہ آیت میں لازماً موجود ہوگا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن مجید کے الفاظ میں اس کا کوئی قرینہ موجود نہ ہو۔ اوپر ہم نے جو مثال پیش کی ہے اس میں اس کی نہایت واضح شہادت موجود ہے۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کا یہ تعلق بالکل واضح ہے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ بات کہلا دی گئی کہ قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ تِلْقَاءِ نَفْسِي تو کسی حدیث کا خواہ وہ کسی درجہ کی ہو ہرگز یہ مرتبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ قرآن مجید کے کسی حکم کو منسوخ کر دے۔ قرآن مجید کو اگر منسوخ کر سکتا ہے تو خود قرآن مجید ہی کر سکتا ہے۔ بعض فقہا یہ مانتے ہیں کہ مشہور حدیث قرآن مجید کی کسی آیت کی تخصیص یا تقیید کر سکتی ہے لیکن وہ اس بات کو بھی اصول کی حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں کہ تخصیص

باقی صفحہ ۲۸ پر۔

اصول تدبر حدیث

امین احسن اصلاحی

حدیث اور سنّت میں فرق

حدیث اور سنت کو لوگ عام طور پر بالکل ہم معنی سمجھتے ہیں۔ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ حدیث اور سنت میں آسمان و زمین کا فرق اور دین میں دونوں کا مرتبہ و مقام الگ الگ ہے۔ ان کو ہم معنی سمجھنے سے بڑی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ فہم حدیث کے نقطۂ نظر سے دونوں کے فرق کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

حدیث

حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول یا فعل یا آپ کی کسی تصویب کی روایت کو کہتے ہیں، عام اس سے کہ وہ ثابت شدہ ہو یا اس کا ثابت شدہ ہونا محلِ نزاع ہو۔ محدثین تصویب کے لئے تقریر کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی مسلمان نے کوئی کام کیا اور آپ نے اس کو دیکھا، لیکن اس پر کوئی نکیر نہیں کی اور اس طرح آپ کی تصویب اسے حاصل ہوگئی۔

محدثین حدیث کو 'خبر' کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں اور 'خبر' کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ الخبر يحتمل الصدق والكذب' (خبر صدق و کذب، دونوں کا احتمال رکھتی ہے) یعنی علمائے فن کے نزدیک خبر میں صدق و کذب، دونوں کا احتمال پایا جاتا ہے۔ اسی بنیاد پر احادیث کو ظنی بھی کہتے ہیں گویا ایک حدیث میں صحیح، حسن، ضعیف، موضوع اور مقلوب، سب کچھ ہو سکنے کا امکان پایا جاتا ہے ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ معاملہ بھی الگ الگ ہوگا۔

حدیث یا خبر کی قسمیں

محدثین کے نزدیک حدیث یا خبر کی بڑی قسمیں دو ہیں:

۱۔ خبرِ تواتر

۲۔ خبرِ واحد

خبرِ تواتر

صاحب الکفایۃ فی علم الروایۃ[1]، خطیب بغدادی علیہ الرحمۃ "خبرِ تواتر" کی تعریف یوں کرتے ہیں:

"وہ خبر جس کی روایت اتنے کثیر افراد کریں کہ عادۃً یہ محال معلوم ہو کہ اتنے افراد، بیک وقت، ایک واضح امر میں، جب کہ کسی مجبوری اور دباؤ کا مظنہ بھی نہیں ہے، ایک جھوٹی بات پر اتفاق کریں گے۔"

یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ "خبرِ تواتر" کا اسم تو موجود ہے، لیکن ہمارے علم کے حد تک اس کا کوئی صحیح مسمّٰی موجود نہیں ہے۔ بسا اوقات ایک حدیث کو "خبرِ مشہور" کا درجہ دے دیا جاتا ہے، لیکن تحقیق پر معلوم ہوتا ہے کہ تین ادوار تک اس کے راوی ایک ایک، دو دو ہیں، جب کہ تیسرے یا چوتھے دور میں اس کے راوی زیادہ ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے نزدیک وہ احادیث جنہیں خبرِ متواتر کہا گیا ہے تحقیق طلب ہیں۔ اگر تحقیق کے بعد وہ مذکورہ تعریف پر پوری اتریں تو انہیں متواتر مانیے، لیکن مصنوعی طور پر کسی چیز کو متواتر بنانا صحیح نہیں ہے۔ البتہ یہ بات یہاں یاد رکھیے کہ جہاں تک سنت کا تعلق ہے اس کو جیسا کہ آگے وضاحت ہوگی، تواتر کا درجہ حاصل ہے اور یہ تواتر قولی نہیں بلکہ عملی ہے۔

خبرِ واحد

خبرِ واحد اس کو کہتے ہیں جو خبرِ تواتر کی اس صفتِ قطعیت سے عاری ہو، اگرچہ اس کی روایت بھی ایک سے زیادہ افراد کرنے والے ہوں، لیکن ان کی تعداد اتنی نہ ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ اس میں کسی شک کی گنجائش یا جھوٹ کا امکان نہیں۔ احادیث کا اصل ذخیرہ انہی اخبارِ آحاد پر مشتمل ہے۔

ردّ و قبول کے پہلو سے اخبارِ آحاد کے درجے

صاحب الکفایۃ نے اخبارِ آحاد کو ردّ و قبول کے پہلو سے تین درجوں میں تقسیم کیا ہے:

۱ - اوّل وہ روایات جن کا حق اور لائقِ قبول ہونا واضح ہے۔

۲ - دوسری وہ روایات، جن کا باطل ہونا واضح ہے۔ اور

۳ - تیسری وہ روایات، جن کے حق یا باطل ہونے کا پہلو متعین نہ ہو رہا ہو۔

اب ان کی تفصیل سنیے۔

[1] میں نے حوالہ کے لئے اس کتاب کا انتخاب اس لئے کیا ہے کہ یہ امہاتِ فن میں شامل ہے۔ جہاں تک مطالعہ کا تعلق ہے، میں نے دوسری ضروری کتابیں بھی پڑھ لی ہیں لیکن میرے نزدیک اصولِ حدیث میں سب سے اہم کتاب یہی ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے، دوسرے اصحابِ فن بھی اس کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں۔

وہ روایات جن کا حق اور لائق قبول ہونا واضح ہے

پہلے درجے میں صاحب الکفایۃ ان روایات کو رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہیں۔

(ا) عقل جن کی صحت کی گواہی دیتی ہو (ما تدل العقول علیٰ موجبہٖ) اور جن کو عام عقل (COMMON SENSE) قبول کرتی ہو۔

(ب) جن کا تقاضا نصوصِ قرآن یا نصوصِ سنت کرتے ہوں۔

(ج) جن کو امت نے قبول کیا ہو۔

یہ بات یہاں واضح طور پر ذہن نشین رہنی چاہیئے کہ امت کی قبولیت سے یہاں مراد امت کے اس گروہ کی قبولیت ہے جو بدعات اور تقلیدِ جامد کے مرض سے پاک رہا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

عن ثوبان رضی اللہ عنہ، قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: لا تزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق۔ لا یضرھم من خذلھم حتی یاتی امر اللہ وھم کذالک: (صحیح مسلم۔ کتاب الامارۃ)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ جو کوئی ان کو چھوڑنا چاہے گا وہ ان کو نقصان نہ پہنچا سکے گا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آن پہنچے گا اور وہ اسی حال پر ہوں گے۔

وہ روایات جن کا باطل ہونا واضح ہے

دوسرے درجے میں صاحب الکفایۃ ان روایات کو رکھتے ہیں جو مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہوں۔

(ا) جن کو عقل رد کرتی ہو۔

(ب) جو نصوصِ قرآن اور نصوصِ سنتِ متواتر کے منافی یا اس سے متناقض ہوں۔

(ج) جو ایسے امور سے متعلق ہوں کہ جن میں لوگ بدیہی اور قطعی علم کے محتاج ہوں تاکہ ان پر حجت تمام ہو سکے لیکن اس طرح کا علم ان سے حاصل نہ ہو رہا ہو۔ یا ان کا تعلق ایسے اہم واقعہ سے ہو جس کے باب میں متعدد طریقوں سے روایات ہونا ضروری ہے لیکن اس کی روایت نہایت محدود طریقہ پر ہوئی ہو۔

احناف کے نزدیک عمومِ بلویٰ کی شکل میں (یعنی جہاں ضرورت کی نوعیت کا تقاضا یہ ہو کہ روایت

متعدد طریقوں سے آئے) اخبارِ آحاد کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ ات
اجتہاد اور قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔

وہ روایات جن کے حق یا باطل ہونے کا پہلو معین نہ ہو رہا ہو

تیسرے درجے میں صاحب الکفایۃ ان روایات کو لیتے ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسے احکام روایت ہوتے ہیں جو باہمدگر مختلف ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہو رہا ہو کہ کس پر عمل کیا جائے، کس پر نہ کیا جائے۔

ایسی روایات کے بارے میں ہماری رائے یہ ہے کہ روایات کے الفاظ، قرآن وسنت کے نصوص اور دوسرے پہلوؤں سے غور کر کے ترجیح کی راہ اختیار کی جائے گی اور مرجح روایات قبول کی جائیں گی۔

سنت

سنت کے لغوی معنی ہیں: واضح راستہ، مصروف راستہ، چلتا ہوا راستہ، پٹا ہوا راستہ اور ہموار راستہ۔

قوموں کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جو معاملہ کیا ہے، اور جو سب کے لئے یکساں ہے، اس کو قرآن مجید میں سنت اللہ کہا گیا ہے۔ مثلاً فرمایا۔

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ ۚ وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا ۝ (الاحزاب۔۳۳۔۳۸)

یہی اللہ کی سنت رہی ہے ان لوگوں کے معاملے میں بھی جو پہلے گزرے ہیں۔ اور اللہ کے فیصلہ کے لئے ایک وقت مقرر ہے۔

فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ ۚ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا (فاطر۔ ۳۵ : ۴۳)

پس یہ نہیں انتظار کر رہے ہیں مگر اسی سنتِ الٰہی کا جو اگلوں کے باب میں ظاہر ہوئی۔ تو تم سنتِ الٰہی میں نہ کوئی تبدیلی پاؤ گے اور نہ تم سنتِ الٰہی کو ٹلتے ہی ہوئے پاؤ گے۔

ہمارے زیرِ بحث اس وقت سنتِ نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے۔ یعنی وہ طریقہ جو آپ نے بحیثیت معلمِ شریعت اور بحیثیت کامل نمونہ کے، احکام و مناسک کے ادا کرنے، اور زندگی کو اللہ تعالیٰ کی پسند کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے عملاً اور قولاً لوگوں کو بتایا اور سکھایا۔ یہ فریضہ آپ کی منصبی حیثیت کا تقاضا تھا، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (آلِ عمران۔۳۔۱۶۴)

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ بیشک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝ (الاحزاب۔۳۳۔۲۱)

اور تمہارے لئے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ ان کے لئے جو اللہ کی ملاقات اور روزِ آخرت کی توقع رکھتے ہیں اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندگی کے ہر گوشے میں اتباع کے لئے کامل نمونہ ہیں۔ دین سے متعلق جو احکام اور آداب ہمیں جاننے اور سیکھنے چاہئیں، وہ سب آپ نے اپنی عملی زندگی سے ہمیں بتائے اور سکھائے۔

منکرینِ سنت کا یہ کہنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک خط پہنچا دینے والے قاصد کی ہے بالکل لغو اور بے بنیاد ہے۔ آپ صرف کتاب اللہ کے پہنچا دینے والے ہی نہیں، بلکہ معلمِ شریعت اور مزکّی نفوس بھی ہیں۔ آپ کی زندگی ہمارے لئے کامل نمونہ ہے جس کی ہر شعبہ میں پیروی کر کے ہی ہم اپنے آپ کو ایمان اور اسلام کے سانچہ میں ڈھال سکتے ہیں۔

سنت کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے جو دین قرآن کے ذریعے سے دیا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں صرف اصولی باتیں بیان ہوئی ہیں، جزئیات اور تفصیلات اس میں نہیں بیان ہوئی ہیں۔ ان کی تعلیم اس نے تمام تر معلمِ قرآن یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دی ہے۔ دین کا پورا اور مکمل ڈھانچہ سنتِ رسول سے کھڑا ہوتا ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دوسرے احکام و مناسک کا بنیادی حکم تو قرآن مجید میں دیا گیا ہے لیکن ان میں سے کسی چیز کی جزئیات و تفصیلات نہیں بتائی گئیں، یہاں تک کہ نماز جیسی اہم چیز کے اوقات، اس کی تعداد اور اس کی رکعات تک بھی قرآن مجید میں بیان نہیں ہوئیں۔ یہی حال دوسری تمام عبادات اور دوسرے احکام و شرائع کا بھی ہے۔ مثلاً چوری پر قطعِ ید کا حکم تو قرآن نے دے دیا

لیکن کتنی مقدار کی چوری، چوری ہوگی اور ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے گا، وغیرہ ان تمام امور کا بتانا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا۔ اب اگر ہم سنت کو نکال دیں تو اگرچہ ہم دین کی اصولی باتوں سے واقف ہوں گے، لیکن ان کی عملی شکل سے اسی طرح بے خبر ہوں گے جس طرح دورِ جاہلیت میں دینِ حنیفی کے پیروکار تھے۔ وہ خانۂ کعبہ کی دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ جاتے اور کہتے کہ اے رب! ہم نہیں جانتے کہ تیری عبادت کس طرح کریں، ورنہ اسی طرح سے کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سنت ہی سے واضح ہوتا ہے۔ اسی لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اُوتیتُ القرآنَ و مثلَہٗ معہٗ (میں قرآن دیا گیا ہوں اور اسی کے مانند اس کے ساتھ اور بھی) پس جس طریقہ سے قرآن واجب ہے اسی طریقہ سے سنت بھی واجب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی لئے بھیجا کہ قرآن مجید مبہم نہ رہے، بلکہ مجسم اور کامل شکل میں لوگوں کے سامنے آجائے اور آپ نے عملاً ایسا کر دیا۔

اس سے واضح ہوا کہ قرآن اور سنت میں تعلق روح اور قالب کا ہے۔ یعنی قرآن مجید میں جو روح ہے اس کو سنتِ رسول اللہ سے قالب نصیب ہوتا ہے۔ ان دونوں کی باہمی ترکیب ہی سے دین کا پورا نظام کھڑا ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک کو بھی الگ کر لیجئے تو سارا شیرازہ درہم برہم ہو جائے گا۔

قرآن و سنت کا باہمی نظام عین فطرت ہے

اللہ تعالیٰ نے قرآن و سنت کا یہ باہمی ربط جو قائم فرمایا تو — نعوذ باللہ — یہ کسی سہل انگاری پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہی عقل و فطرت کے مطابق ہے۔ انسانی زندگی کے امور اتنے کثیر ہیں کہ وہ کسی ایک کتاب میں نہیں سما سکتے تھے، ان کے لئے دفاتر کی ضرورت تھی۔

دوسرے یہ کہ بہت سی چیزیں صرف بتانے کی نہیں، بلکہ عملاً کر کے دکھانے کی ہوتی ہیں۔ اس کے بغیر ان کی تعلیم نافع نہیں ہو سکتی۔ جو چیزیں کر کے دکھانے کی ہوں وہ بتائی جا بھی نہیں سکتیں۔ اس کام کے اوپر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور ان کے بعد امت میں آنے والے شہداء اللہ فی الارض مامور ہوئے۔ اس وجہ سے جو لوگ اہلِ دین ہوں اور دین کا کام کرنے اٹھیں، ان کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ سنت کے اوپر عمل کرنے کی پوری کوشش کریں اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں بھی اس کا اہتمام کریں، تاکہ دوسروں کو اس سے سنت پر عمل کرنے کی ترغیب ہو۔

سنت کا دائرہ

یہاں یہ حقیقت پیشِ نظر رہے کہ سنت کا تمام تر تعلق عملی زندگی سے ہے، یعنی ان چیزوں سے جو کرنے کی ہیں۔ وہ چیزیں اس کے دائرہ سے الگ ہیں جو محض عقائدی اور علمی نوعیت کی ہیں۔ مثلاً ایمانیات، تاریخ

اور شانِ نزول وغیرہ کی قسم کی چیزوں کو سنت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

سنت کی بنیاد احادیث پر نہیں، بلکہ امت کے عملی تواتر پر ہے

سنت کی بنیاد احادیث پر نہیں ہے، جن میں صدق و کذب، دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہوا بلکہ امت کے عملی تواتر پر ہے۔

جس طرح قرآن قولی تواتر سے ثابت ہے اسی طرح سنت امت کے عملی تواتر سے ثابت ہے۔ مثلاً ہم نے نماز اور حج وغیرہ کی تمام تفصیلات اس وجہ سے نہیں اختیار کیں کہ ان کو چند راویوں نے بیان کیا بلکہ یہ چیزیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائیں۔ آپ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے، ان سے تابعین نے، پھر تبع تابعین نے سیکھا۔ اسی طرح بعد والے اپنے اگلوں سے سیکھتے چلے آئے۔ اگر روایات کے ریکارڈ میں ان کی تائید موجود ہے تو یہ اس کی مزید شہادت ہے۔ اگر وہ عملی تواتر کے مطابق ہے تو فبہا اور اگر دونوں میں فرق ہے تو ترجیح بہرحال امت کے عملی تواتر کو حاصل ہوگی۔ اگر کسی معاملے میں اخبارِ آحاد ایسی ہیں کہ عملی تواتر کے ساتھ ان کی مطابقت نہیں ہو رہی ہے تو ان کی توجیہ تلاش کی جائے گی۔ اگر توجیہ نہیں ہو سکے گی تو بہرحال انہیں مجبوراً چھوڑ دیا جائے گا، اس لئے کہ وہ ظنی ہیں اور سنت، ان کے بالمقابل قطعی ہے۔

اخبارِ آحاد کے بالمقابل عملِ اہلِ مدینہ کو ترجیح دینے کے باب میں مالکیہ کا مسلک اسی اصول پر مبنی ہے۔ وہ عملِ اہلِ مدینہ کو حجت مانتے ہیں اور اس کو السنۃ عندنا ھکذا (سنت ہمارے ہاں اس طرح ہے) سے تعبیر کرتے ہیں۔ احناف بھی عمومِ بلویٰ میں اخبارِ آحاد کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اس میں بھی وہی سپرٹ ہے۔

یہاں اس امر کو بھی ذہن نشین رکھئے کہ امت کے عملی تواتر سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: علیکم بسنتی و سنۃ الخلفاء الراشدین (تم پر میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کی پیروی واجب ہے) دین کا مرکز یہی گروہ ہے۔ اس وقت جو بھیڑ ایسے اعمال کی حامل ہے جو قرآن و سنت سے صریحاً متناقض ہیں تو یہ سب اہلِ بدعت ہیں اور بدعت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ بدعت گمراہی ہے اور گمراہی کا ٹھکانا جہنم ہے۔

منکرینِ سنت سے سوال

منکرینِ سنت قرآن کو ماننے کے مدعی ہیں، لیکن سنت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کی یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لئے کہ جس طرح قرآن امت کے قولی تواتر سے ثابت ہے اسی طرح سے سنت

امت کے عملی تواتر سے ثابت ہے۔ یہ لوگ جب سنت کو نہیں مانتے تو قرآن کو ماننے کی بھی کوئی وجہ باقی نہیں رہ جاتی۔ قرآن اور سنت میں ثبوت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے۔ وہ قولی تواتر سے ثابت ہے، یہ عملی تواتر سے ثابت ہے۔

یہ ضروری ہے کہ حدیث اور سنت کے درمیان جو فرق ہم نے واضح کیا ہے اس کو ملحوظ رکھا جائے۔ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند حدیثوں کے انکار کو انکارِ سنت کے مترادف سمجھ لیا گیا اور پھر منکرینِ حدیث نے حدیث کے خلاف جو شبہات ایجاد کئے، وہ انہوں نے سنت پر بھی پھیلا دیئے، حالانکہ سنت کا انکار، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، خود قرآن کے انکار کے ہم معنی ہے۔

انکارِ حدیث کے فتنہ کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصلاً یہ فتنہ چند الجھن پیدا کرنے والی حدیثوں سے اٹھا لیکن بعد میں جب یہ مسئلہ مناظرہ کا موضوع بن گیا تو بحث کی گرماگرمی میں لوگ حدیث اور سنت کے فرق کو بھول گئے۔ نہ حملہ کرنے والوں کو ہوش رہا کہ وہ کس چیز پر حملہ کر رہے ہیں اور نہ مدافعت کرنے والے یہ اندازہ کر سکے کہ انہیں کس چیز کی مدافعت کرنی ہے اور وہ کس محاذ پر اپنا زور صرف کر رہے ہیں۔ اس بے خبری میں دونوں نے نقصان اٹھایا۔ منکرینِ حدیث نے اپنی بات جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، کفر تک پہنچا دی اور حامیانِ حدیث نے بلاوجہ حدیث کے ساتھ سنت کو بھی ہدف پر لا کھڑا کیا۔

ایک ہی معاملے میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے

اسی طرح لوگ اس حقیقت سے بھی ناواقف ہیں کہ ایک ہی معاملے میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ اس ناواقفیت کے سبب سے خود اہلِ سنت کے درمیان مختلف فرقے بن گئے اور وہ آپس میں ایک دوسرے کو مخالفتِ سنت کا ملزم ٹھہراتے ہیں حالانکہ اگر وہ انصاف سے کام لیں تو یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ ایک ہی معاملہ میں سنت مختلف بھی ہو سکتی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقع پر روایات میں آتا ہے کہ حج کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک جگہ بیٹھ گئے اور لوگوں کے وفود آپ کی خدمت میں آنے شروع ہوئے۔ کوئی کہتا کہ حضورؐ میں نے فلاں کام اس طرح کیا۔ آپ جواب دیتے کہ کچھ حرج نہیں۔ دوسرا عرض کرتا کہ حضور میں نے فلاں کام اس طرح کیا۔ آپ اس کی بھی تصویب فرما دیتے کہ ٹھیک ہے۔ یکے بعد دیگرے لوگ آتے اور سوال کرتے رہے اور جہاں تک علم ہے، آپ نے سب کی تصویب فرمائی کسی پر نکیر نہیں کی۔

ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ سب کا فعل سنت کے دائرہ کے اندر ہی رہا ہوگا۔ مغزدوح

باقی صفحہ ۶ پر

تدبرِ حدیث

خالد مسعود

موحدین کے گناہوں کی مغفرت

عن ابی الاسود الدیلی ان اباذر حدثه قال اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم وهو نائم علیه ثوب ابیض ثم اتیته فاذا هو نائم ثم اتیته وقد استیقظ فجلست الیه فقال ما من عبد قال لا اله الا الله ثم مات علی ذلک الا دخل الجنة قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق قلت وان زنی وان سرق قال وان زنی وان سرق ثلاثا ثم قال فی الرابعة علی رغم انف ابی ذر قال فخرج ابو ذر وهو یقول وان رغم انف ابی ذر (صحیح مسلم باب من مات لا یشرک بالله شیئاً دخل الجنة)

"ابوالاسود دیلی بیان کرتے ہیں کہ ابوذرؓ نے انہیں بتایا کہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں گیا تو آپ ایک سفید چادر لیے سو رہے تھے۔ میں دوبارہ گیا جب بھی آپ سو رہے تھے۔ میں پھر حاضر ہوا تو آپ بیدار ہو چکے تھے۔ میں آپ کی خدمت میں بیٹھ گیا تو آپ نے فرمایا: ایسا کوئی بندہ نہ ہوگا جس نے لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کر لیا اور پھر اسی اقرار پر اس کی موت واقع ہوئی کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو۔ اس پر میں نے عرض کی: اگر وہ کبھی زنا کا مرتکب ہوا یا چوری کر لی تو! آنحضرتؐ نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ زنا کا مرتکب ہوا یا اس نے چوری کی۔ میں نے کہا کیا وہ زنا کا مرتکب ہوا اور چوری کی تب بھی! آپ نے فرمایا۔ ہاں اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کی تب بھی۔ یہ کلمات تین دفعہ کہے گئے۔ چوتھی مرتبہ آنحضرتؐ نے فرمایا: خواہ ابوذرؓ اس پر ناک بھوں چڑھائے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابوذرؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے نکلے تو ان کی زبان پہ یہ الفاظ تھے: خواہ ابوذر اس پر ناک بھوں چڑھائے۔"

روایت کی دوسری سند ابوذرؓ سے اس واقعہ کی روایت معرورؒ بن سوید نے بھی کی ہے۔ اس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:

عن المعرور بن سوید قال سمعت اباذر یحدث عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال اتانی جبریل علیه السلام فبشرنی انه من مات من امتک لا یشرک

باللہ شیئاً دخل الجنۃ قلت وان زنیٰ وان سرق قال وان زنیٰ وان سرق۔

"معرور بن سوید کہتے ہیں کہ میں نے ابوذرؓ کو بیان کرتے سنا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور بشارت دی کہ تمہاری امت میں سے جو شخص اس حال میں مرے گا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا ہو گا وہ جنت میں داخل ہو گا۔ اس پر میں نے پوچھا۔ اگر اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کر لی تب بھی! تو جبریل نے کہا، ہاں اگر اس نے زنا کا ارتکاب کیا یا چوری کر لی تب بھی!"

اس روایت میں اگرچہ جبریل علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا جس سے یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ ابوذرؓ ہی کی بات نقل ہوئی ہو لیکن دوسرے واسطے سے روایت میں "یا جبریل" کے الفاظ کا اضافہ ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ معرور بن سوید کی روایت میں سوال وجواب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور جبریل علیہ السلام کے مابین ہوئے۔

مذکورہ دونوں روایتوں کے تقابل سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں صورت واقعہ دو مختلف انداز سے پیش کی گئی ہے۔ پہلی روایت میں جبریل امینؑ کا کوئی حوالہ نہیں اور "ان زنیٰ وان سرق" کے الفاظ میں سوال ابوذرؓ نے کیا ہے۔ دوسری روایت میں یہ سوال خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل ہوا ہے اور اس کا جواب دینے والے جبریلؑ ہیں۔ اس روایت میں ابوذرؓ کا اپنا ردعمل بالکل بیان نہیں ہوا۔

اس بات میں شبہ کرنے کی تو کوئی گنجائش نہیں کہ ان دونوں واسطوں سے یہ روایت ایک ہی واقعہ کو بیان کرتی ہے لیکن یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بیان میں اتنا فرق کیوں کر واقع ہو گیا ہے آیا کسی راوی نے ابوذرؓ کی بات سمجھنے میں غلطی کی ہے یا اسے یاد نہیں رکھ سکے۔ ہمارے نزدیک زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ واقعہ کا ایک حصہ ایک روایت میں بیان ہوا ہو اور دوسرا حصہ دوسری روایت میں۔ اس طرح کے مواقع پہ روایتیں ایک دوسری کے خلا کو بھر دیتی ہیں اس لئے صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لئے روایات کو جمع کر دینا مناسب ہوتا ہے۔ جمع روایات کے بعد یہ روایت کچھ یوں بنتی ہے۔

"جبریل امینؑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کو یہ خوشخبری دی کہ کوئی ایسا موحد بندہ نہ ہو گا جس نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا، پھر خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا اور اسی موقف پہ قائم رہ کر اس نے اپنی جان خدا کے حوالے کی کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریلؑ سے وضاحت چاہی کہ اس صورت میں کیا ہو گا جب اس شخص سے کبھی زنا یا چوری کا ارتکاب ہو گیا ہو جبریل نے جواب دیا، تب بھی وہ جنت میں داخل ہو گا۔ جبریل کے ساتھ اس گفتگو کے بعد ابوذرؓ حضور سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے تو آپ نے یہ واقعہ ان کو سنایا۔ ابوذرؓ کے لئے یہ بات بڑے اچنبھے کا باعث ہوئی۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا اس لئے انہوں نے بار بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ وضاحت چاہی کہ کیا اس صورت میں بھی بندۂ مومن کی مغفرت ہو جائے گی اگر زنا یا چوری کا ارتکاب ہو گیا ہو۔ آنحضرتؐ نے ہر بار اس بات کی تصدیق فرمائی اور یہ دیکھتے ہوئے کہ ابوذرؓ کو اس بات پر کسی طرح یقین نہیں آ رہا ہے۔ آپ نے آخر میں فرمایا ہاں ابوذرؓ اس حقیقت پر ناک بھوں چڑھائے تب بھی ایسا ہی ہو گا۔"

وضاحتِ حدیث اس حدیث کے مضمون کو ہم سہولت کے لئے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں اس شخص کے لئے جنت کی بشارت ہے جس نے مرتے دم تک توحید کا دامن نہ چھوڑا اور شرک کی آلودگی سے اپنے کو بچاتا رہا۔ دوسرا یہ کہ بشارت ایسے شخص کے لئے بھی ہے جس سے شرک کا گناہ تو سرزد نہیں ہوا لیکن کسی دوسرے بڑے گناہ کا وہ مرتکب ہو گیا۔ اب ہم ان دونوں حصوں کی الگ الگ وضاحت کریں گے۔

شرک کا گناہ یہ حقیقت کہ وعدۂ جنت صرف موحدین کے لئے ہے اور شرک کرنے والوں کے لئے اس میں کوئی حصہ نہیں، قرآن مجید کے ایک طالب علم سے مخفی نہیں رہ سکتی کیونکہ قرآن کی تمام تر دعوت اسی ہدف کی طرف مرکوز ہے۔ اس میں شرک کو سب سے بڑا ظلم اور افترا پردازی قرار دیا گیا ہے اور دوٹوک الفاظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ ہرگز معاف کرنے والا نہیں۔ اس کی مغفرت کے مستحق صرف اس کے موحد بندے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے جب سب سے بڑے گناہ کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا شرک تمام کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑا ہے۔ اس مضمون کو آپ نے قاعدہ کلیہ کے سے الفاظ میں ذہنوں پر مرتسم کرنے کی کوشش فرمائی۔ اس مضمون کی تمام روایات کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں؛ صرف مثال کے لئے ہم مندرجہ ذیل دو روایتوں کے انداز اور اسلوب کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں:

عن جابر قال اتی النبی صلی اللہ علیہ وسلم رجل فقال یا رسول اللہ ما الموجبتان فقال من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنۃ ومن مات یشرک باللہ شیئاً دخل النار (صحیح مسلم، باب من مات لا یشرک باللہ شیئاً دخل الجنۃ)

"جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور پوچھا یا رسول اللہ! واجب کر دینے والی دو چیزیں کونسی ہیں۔ آپ نے فرمایا جو شخص اس حال میں مرا کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراتا تھا وہ جنت میں داخل ہوگا اور جو شخص اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتا ہوا مرا وہ دوزخ میں داخل ہوگا۔"

دوسری روایت میں یہ بیان ہوا ہے کہ معاذ بن جبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک ہی سواری پر سوار تھے۔ دوران سفر حضورؐ نے معاذؓ سے پوچھا جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا۔ اِنّ حق اللہ علی العباد ان یعبدوا اللہ ولا یشرکوا بہ شیأ وحق العباد علی اللہ عز وجل ان لا یعذب من لا یشرک بہ شیأ (مسلم، باب من لقی اللہ بالایمان) (اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ عز وجل پر یہ ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کو عذاب نہ دے جو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا)

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ روایت کے مضمون کا پہلا حصہ قرآن مجید اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ثابت ہے۔ اس کے بارے میں اگر کوئی سوال پیدا ہوتا ہے تو یہ کہ شرک کیوں قابل معافی نہیں اور نجات صرف توحید ہی پر کیوں منحصر ہے۔ ہمارے نزدیک اس کی سمجھنے کے لئے خدا اور بندے کے تعلق کو بنیادی طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان ایک شتر بے مہار کی طرح نہیں جس کا کوئی مالک ہو اور نہ کوئی متعین راہ اور منزل۔ یہ ایک خودرو وجود بھی نہیں جس نے اپنے بل بوتے پر قائم رہنا ہے اور کسی کی بالادستی اسے تسلیم نہیں۔ اس کی اصل حیثیت اس عظیم کائنات کی کروڑوں مخلوقات میں سے ایک مخلوق کی ہے جسے اس کے پیدا کرنے والے نے ایک ذمہ دار مخلوق کی حیثیت سے پیدا کیا۔ اسے بہترین صلاحیتوں سے نوازا، اس نے دنیا کے وسائل اس کی خدمت میں لگا دیئے، اسے نیک فطرت، عقل، ارادہ اور اختیار دیا اور اس کی ذمہ داریوں سے اسے آگاہ کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے ایک محدود موقع دے کر آزمانا چاہتا ہے کہ کون بندہ اپنے خالق، مالک اور آقا کو پہچانتا اور اس کا وفادار ثابت ہو کر اس کے حقوق ادا کرتا ہے اور کون اس کے برعکس رویہ اختیار کرتا ہے۔ جو شخص اپنی اصل حیثیت کو جان چکا ہو وہ اپنے مالک کو پہچاننے اور اس کے حقوق ادا کرنے میں غلطی نہیں کرتا۔ اسی خداشناسی کا نام توحید ہے۔ یہ توحید دین کی رو سے سب سے بڑی

نیکی اور دوسری تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس کو اختیار کر کے بندہ اس راہ پر چل کھڑا ہوتا ہے جو اسے اپنے رب کی طرف پہنچاتی ہے۔ اس راہ سے بھٹکانے میں اگر کوئی چیز سبب بنتی ہے تو وہ آدمی کے جذبات، اس کی خواہشات اور عواطف ہوتے ہیں جن کے ساتھ اسے زندگی بھر کشمکش کرنی پڑتی ہے۔ اس کشمکش کے دوران شیطان برابر اس کو بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے اور بسا اوقات اس میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے لیکن بندہ اگر مخلص ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق صحیح اساس پر قائم ہو تو وہ شیطان سے وقتی طور پر شکست کھانے کے باوجود بھی سنبھل جاتا اور خدا سے اپنی نالائقی کی معافی مانگ کر پھر اپنی سمت خدا کی طرف کر لیتا ہے۔ اگر وہ اپنے اس شعور کو بیدار رکھے تو وہ گرتا پڑتا بہرحال اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتا ہے کیونکہ اس کا سفر صحیح سمت میں تھا۔

اس کے برعکس انسان جب نہ اپنے مالک و آقا کو پہچانتا اور نہ اپنی حیثیت کو درست طور پر متعین کرتا ہے تو وہ شرک میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ پاتا رب سے ہے لیکن گن دوسروں کے گاتا ہے، اس کی زندگی خدا کے قبضہ میں ہوتی ہے لیکن دوسروں کو اپنے لئے نافع و ضار سمجھتا ہے، اس کے معبود اللہ کے سوا دوسرے بھی ہوتے ہیں جن کے ناموں کی وہ دہائی دیتا اور ان سے طالب مدد ہوتا ہے۔ وہ اپنے اس رویہ سے اپنے غیور خداوند کی غیرت کو چیلنج کرتا ہے لہٰذا اس کا رویہ خدا کی نگاہوں میں باغیانہ قرار پاتا ہے۔ عملاً اس کا رخ اس صراط مستقیم سے ہٹ جاتا ہے جو بندے کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ اس لئے وہ جتنا آگے بڑھتا رہتا ہے اس کی راہ اصل منزل سے دور تر ہوتی جاتی ہے۔ اس راہ میں وہ شیطان کا آلہ کار بن جاتا ہے لہٰذا اس کا ہر کام خواہ وہ بظاہر نیکی نظر آئے نیکی کی روح سے خالی ہوتا ہے۔ اس کی زندگی مفاسد سے عبارت ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں شرک تمام شر کا سرچشمہ ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک بندہ خدا کے باغیوں اور بے وفاؤں کی صف میں جا کھڑا ہوتا ہے اور بغاوت اور بے وفائی سے بڑا کوئی جرم نہیں۔

خیر اور شر دونوں کا اختیار رکھتے ہوئے جب ایک بندہ خیر کو اختیار کرتا ہے (جس کی اصل توحید ہے) تو اس کا یہ عمل خدا کو محبوب ہوتا ہے۔ جب بندے کی زندگی بھر کی جدوجہد اسی ایک ہدف کے لئے ہوتی ہے اور وہ اسی پر جان دیتا ہے تو گویا اس نے اپنا حق عبودیت ادا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ قدرشناس ہے وہ اپنے بندے کو اس کا معاوضہ جنت کی صورت میں دے گا۔ اس کے برعکس شرک کو اختیار کرنے والا ہر ہمدردی سے محروم ہو کر سزا کا مستحق ہو جاتا ہے اور خدا کے ہاں اس کے لئے ابدی جہنم ہوگی۔

ارتکابِ معاصی کے باوجود بخشش | اب روایت کے دوسرے حصہ کی طرف آیئے۔ اس سے عام طور پر جو مفہوم اخذ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ لاالٰہ الا اللہ کہنے والوں کے لئے شاید زنا اور سرقہ کی شناعت میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور امت مرحومہ کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص کا مظاہرہ فرماتے ہوئے ان جرائم کو بھی نظر انداز کر دے گا۔ جو لوگ ذرا محتاط ہیں وہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والے مسلمان کو سزا تو ہو گی لیکن سزا بھگتنے کے بعد اسے جنت میں پہنچا دیا جائے گا۔ اس طرح وہ حدیث میں بیان کئے گئے مژدے کا مصداق بن جائے گا۔ ہمارے نزدیک معاملہ کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہماری معروضات حسب ذیل ہیں:

امت مرحومہ کے لئے صحیفۂ ہدایت قرآن مجید ہے۔ جو سنن الٰہیہ اس میں بتا دی گئی ہیں، ہی ہر ملت وامت (بشمول امت مسلمہ) کے معاملے میں جاری ہوں گی۔ قرآن مجید نے نیکی اور بدی کو راز رہنے دیا ہے نہ ان کے نتائج کو بیان کرنے میں اجمال سے کام لیا ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ کسی بھی روایت کی توجیہ و تاویل کرتے ہوئے ہم قرآن مجید کی محکمات کو پس پشت نہ ڈالیں۔ اب اسی زنا اور سرقہ کو لیجئے۔ ان کی حیثیت قرآن کے لحاظ سے یہ ہے کہ یہ خداوند تعالیٰ کے محرمات میں سے ہیں۔ فرمایا

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ (اعراف ۳۳)

کہہ دو خدا نے حرام تو بس بے حیائیوں کو ٹھہرایا ہے، خواہ کھلی ہوں خواہ پوشیدہ اور حق تلفی اور ناحق زیادتی کو......

امت مسلمہ کو مخاطب کر کے نہایت واضح الفاظ میں فرمایا کہ زنا کے قریب بھی نہ پھٹکنا، یہ نہایت برا راستہ ہے۔

لَا تَقْرَبُوا الزِّنَىٰ إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا (بنی اسرائیل ۳۲)

زنا کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ یہ بلاشبہ ایک بے حیائی ہے اور نہایت ہی برا راستہ۔

اللہ کے حقیقی بندوں کی صفات میں ان کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ لَا يَزْنُونَ (وہ زنا نہیں کرتے) جب ان آیات میں خطاب امت مسلمہ ہی سے ہے تو یہ خیال بالبداہت غلط ہو جاتا ہے کہ زنا اور سرقہ کے گناہوں کی حیثیت دوسری قوموں کے لئے اور ہے اور امت مسلمہ کے لئے اسے مختلف رکھا گیا ہے۔

جہاں تک گناہ کے انجام کا تعلق ہے قرآن مجید نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ ہر گناہ کی ذمہ داری

گناہ کرنے والے پر ہے، اس پر اس کا مواخذہ ہو گا فرمایا وَمَن يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ (نساء ۱۱۱) اور جو کسی بدی کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پر آئے گا۔ البتہ گناہوں میں دو طرح کے گناہ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن کو بڑے گناہوں میں شامل کیا گیا ہے اور محکم الفاظ میں ان سے روک دیا گیا ہے۔ دوسرے وہ جو بڑے گناہوں کی تعریف میں نہیں آتے، یہ لغزشیں ہوتی ہیں جو بشری تقاضے سے ایک بندہ سے ہو جاتی ہیں۔ یہ لغزشیں بندے کی ان چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے ذریعے محو ہوتی رہتی ہیں جو وہ روزانہ کرتا رہتا ہے۔ لیکن بڑے گناہوں کا معاملہ یہ نہیں فرمایا:

إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا (نساء ۳۱)

تم جن باتوں سے روکے جا رہے ہو اگر ان کے بڑے گناہوں سے تم بچتے رہے تو ہم تم سے تمہاری چھوٹی برائیاں جھاڑ دیں گے اور تمہیں ایک عزت کے مقام میں داخل کریں گے۔

ایک بندہ مومن کے لئے بڑے گناہوں کے ارتکاب کی دو ہی وجہیں ہو سکتی ہیں یا تو اسے اس گناہ کی شناعت اور اس کے بارے میں خدا کے حکم کا علم نہ ہو یا وہ کسی وقتی جذبے سے مغلوب ہو کر اس کا ارتکاب کر بیٹھے۔ پہلی صورت عملاً پیش نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے گناہوں کا تصور ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے اور جاہل سے جاہل معاشرہ میں بھی ان کے گناہ ہونے میں شک نہیں کیا جاتا۔ ایمان تو بہرحال ایک سلیم الفطرت آدمی کا حصہ ہے اس لئے بندہ مومن بڑے گناہوں کی ماہیت سے کیسے بے خبر ہو سکتا ہے۔ دوسری صورت میں گناہ ایک بندۂ مومن سے سرزد تو ہو سکتا ہے لیکن یہ اس کے کردار کا مستقل حصہ نہیں بن سکتا بلکہ جب وہ کسی وقت اس کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے تو اس کا ضمیر فوراً اس کو ملامت کرتا ہے اور وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے گنہگاروں کے لئے مغفرت کی خبر دی گئی ہے۔ فرمایا

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ ۖ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَىٰ نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۖ أَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنكُمْ سُوءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِن بَعْدِهِ وَأَصْلَحَ فَأَنَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (انعام ۵۴)

اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لائے تو تم ان کو کہو کہ تم پر سلامتی ہو، تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے۔ جو کوئی تم میں سے نادانی سے کوئی برائی کر بیٹھے گا پھر وہ اس کے بعد توبہ اور اصلاح کرے گا تو وہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔

ہمارے نزدیک حدیث کی بشارت ایسے ہی مومن گناہگاروں کے لئے ہے۔ یہ ان کے لئے نہیں جرم جن کی عادت ثانیہ بن چکا ہو اور انہیں توبہ کی توفیق نہ ہوئی ہو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس مضمون کو اچھی طرح واضح فرمایا ہے۔ آپ نے بڑے گناہوں کا ارتکاب کرنے والے مومن کی حالت یوں بیان فرمائی ہے۔

عن ابی ھریرۃ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لا یزنی الزانی حین یزنی وھو مومن ولا یسرق حین یسرق وھو مومن ولا یشرب الخمر حین یشربھا وھو مومن والتوبۃ معروضۃ بعد (مسلم باب بیان انہ لا یدخل الجنۃ الا المومنون)

"حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک زانی جب زنا کا ارتکاب کرتا ہے تو وہ حالت ایمان میں زنا نہیں کرتا۔ ایک چور جب چوری کا مرتکب ہوتا ہے تو وہ حالت ایمان میں چوری نہیں کرتا۔ ایک شرابی جب شراب پیتا ہے تو وہ حالت ایمان میں شراب نہیں پیتا۔ توبہ ارتکاب فعل کے بعد پیش کی جاتی ہے۔"

یہ حدیث ہمارے موقف کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ایمان اور عمل فاسد میں منافرت ہے۔ ایک شخص جب محرمات میں ملوث ہوتا ہے تو وہ ایمان سے عاری ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایمان دل کے یقین سے پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ آگ کا کام جلا دینا ہے تو ہم اس میں ہاتھ ڈالنے کی کبھی جرأت نہیں کرتے۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو یا تو اسے آگ کی جلانے کی خاصیت کا علم نہیں ہوتا یا کوئی وقتی جذبہ اسے اندھا کر دیتا اور وہ آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ ایک بندے کے اندر جب ایمان پختہ ہوتا ہے تو وہ محرمات سے اپنے آپ کو اسی طرح بچاتا ہے جیسے ایک عاقل آدمی اپنے آپ کو آگ سے، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ محرمات میں پڑنا خداوند تعالیٰ کی نگاہوں میں اسے ذلیل اور مستوجب سزا کر دے گا۔ لہٰذا کسی عمل فاسد کو اختیار کرنا اسی شخص کے لئے ممکن ہے جس کا دل یا تو ایمان سے عاری ہو یا جسے خواہشات اور جذبات کی رو میں ایمان کے تقاضوں کا خیال نہ رہے۔

دوسری حقیقت جو اس روایت سے واضح ہوتی ہے یہ ہے کہ ارتکاب گناہ کے بعد ایک بندہ مومن کے سامنے توبہ پیش کی جاتی ہے یعنی اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا ہے، اسے اپنی غلطی پر ندامت کا احساس ہوتا ہے اور اسے اپنے رب کی طرف رجوع کر کے معافی کا طلب گار ہونے کی

توفیق ہوتی ہے۔ اگر وہ ایسا کر لیتا ہے تو اس کا ایمان جو ارتکاب گناہ کے وقت اس کے اندر سے نکل چکا تھا واپس لوٹ آتا ہے۔ لیکن فرض کیجئے کہ ایک شخص پہ یہ توبہ پیش کی گئی لیکن اس نے اس کو نظر انداز کر دیا تو اس شخص پہ سے اس کے گناہ کا اثر بد کیسے ختم ہوگا جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے۔ اگر وہ بدقسمت اصلاح حال کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا اور گناہ اس کی زندگی کا احاطہ کر لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ کلمہ توحید کا زبانی اقرار اس کے کسی کام نہیں آ سکتا اور وہ اپنے آپ کو اس بدقسمت گروہ میں شامل کر لیتا ہے جس کے متعلق قرآن نے نہایت دو ٹوک الفاظ میں فرمایا ہے کہ

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۸۱)

ہاں جس نے کوئی بدی کمائی اور اس کے گناہ نے اس کو اپنے گھیرے میں لے لیا تو وہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ظاہر ہے کہ یہ شخص وعدہ جنت کا مستحق نہیں اور وہ کسی طرح حدیث کا مصداق نہیں ہو سکتا۔ ایسے شخص کے لئے اس بات کا امکان بھی نہیں کہ وہ چند روز سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جا براجے، جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے۔

ایک گناہگار کا محض توبہ کر لینا بھی اس بات کے لئے کافی نہیں ہوتا کہ اس کا گناہ معاف کر دیا جائے۔ قبولیت توبہ پر بہت سی قیدیں خود قرآن مجید سے ثابت ہیں مثلاً یہ کہ گناہ دل کے محکم ارادے سے نہیں بلکہ جذبات کی رو میں ہو گیا ہو، بندہ اپنے کئے پر فوری طور پہ نادم ہو، ندامت کے اظہار میں تاخیر نہ کرے، وہ اللہ سے اپنی غلطی کی معافی چاہے، وہ اس فعل بد کو دہرانے کی تمنا نہ رکھتا ہو بلکہ فی الفور اپنی اصلاح کر لے۔ قرآن مجید کی رو سے بڑے گناہوں کی توبہ اسی وقت قبول ہوگی جب ان شرائط کو وہ پورا کرے گی۔

جہاں تک حدیث زیر بحث کی اندرونی شہادت کا تعلق ہے اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ وعدہ جنت کا مستحق ہر قسم کے گناہگار کو نہ سمجھا جائے۔ اولاً "ان زنی وان سرق" میں فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے، صفت کا نہیں۔ فعل کے صیغے سے عادی زانی اور عادی چور ہونے کے معنی پیدا نہیں ہوتے۔ ثانیاً صیغہ ماضی کے ساتھ "اِنْ" کا حرف یہ معنی دیتا ہے کہ فعل کبھی کبھار واقع ہوا ہو۔ عام وقوع پذیر ہونے والے فعل کے لئے یہ اسلوب استعمال نہیں ہوتا۔ ثالثاً جبریل امینؑ سے حضورؐ کا وضاحت طلب کرنا اور ابو ذرؓ کا حیرت و استعجاب کا اظہار یہ بتاتا ہے کہ زنا اور سرقہ کے جرائم بہرحال توحید کے اقرار کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں رکھتے اور ان کی مغفرت کا معاملہ اتنا سادہ نہیں کہ اسے معمول کی ایک کارروائی

سمجھ لیا جائے۔ رابعاً "ثم مات علی ذالک" کے الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بندہ ایمان سے عاری ہونے کی حالت میں نہیں مرا بلکہ جب موت آئی تو وہ مومن تھا۔ یہ عملاً اسی وقت ممکن ہے جب ارتکاب گناہ کے بعد کی زندگی اس نے اصلاح کے ساتھ گزاری ہو اور اسی حالت میں اس کی موت واقع ہوئی ہو۔

قرآن مجید کی مذکورہ تصریحات، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت اور حدیث کی اندرونی شہادت کی روشنی میں خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ابوذرؓ کی روایت میں "ان زنی وان سرق" کا مصداق وہ لوگ نہیں ہوں گے جو زنا اور سرقہ کے عادی مجرم ہوں، جنہیں اپنے اس فعل پر ندامت اور توبہ کی توفیق نہیں ہوئی اور جنہوں نے توبہ کی وہ شرائط پوری نہیں کیں جو قرآن مجید نے بیان کی ہیں۔

اب روایت مذکورہ صدر کے دونوں حصوں کو جمع کیجئے تو اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ خدا کے ہاں عذر جنت صرف اس شخص کے لئے ہے جو توحید پر ایمان رکھتا ہو، ساری عمر وہ اس کے تقاضوں پر کاربند ہے اور اسی پر اپنی زندگی کا آخری سانس لے۔ شرک ایک ایسا گناہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں ناقابل معافی ہے اس کے سوا دوسرے گناہ خواہ وہ زنا اور سرقہ جیسے سنگین جرائم کیوں نہ ہوں اس بندۂ مومن کے تئے بخش دیئے جائیں گے جو اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ شرائط کے مطابق توبہ و استغفار کرے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ حدیث قرآن مجید کی آیت

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا (نساء ۱۱۶)	بے شک اللہ اس چیز کو نہیں بخشے گا کہ اس کا شریک ٹھہرایا جائے، اس کے نیچے جس کے لئے چاہے گا، بخش دے گا اور جو اللہ کا شریک ٹھہرائے گا وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔

ہی کی ایک وضاحت ہے۔

تزکیۂ نفس

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اس کی اساسات (۴)

محبت

ایمان کے تقاضے پورے کرنے کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کرے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ عبادت واطاعت اس کی سچی محبت کے ساتھ ہو۔ اگر یہ چیز نہ ہو تو یہ عبادت واطاعت نفاق اور ریاکاری بن کے رہ جاتی ہے، جس کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی پوچھ نہیں ہے۔ وہ ہمارے کسی عمل کا محتاج نہیں ہے کہ جس طرح کبھی کوئی شخص کوئی عمل کردے اس کو قبول کرلے۔ وہ صرف اسی عمل کو قبول فرماتا ہے جو خالص اسی کے لئے کیا جائے اور مارے باندھے نہیں، بلکہ اس کی سچی محبت کے ساتھ کیا جائے۔ اس محبت کے لئے معیار یہ ٹھہرایا گیا ہے کہ یہ دنیا کی تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ کر ہو۔

قرآن مجید میں اس کی حد یہ مقرر فرمائی گئی ہے:

قُلْ إِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (التوبہ - ۹ : ۲۴)	ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان اور وہ مال جو تم نے کمایا اور تجارت جس کی کسادبازاری کا تم کو اندیشہ ہے اور وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں اگر تمہیں اللہ، اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمادے اور اللہ بدعہدوں کو بامراد نہیں کرتا۔

یہی بات حدیثوں میں یوں وارد ہوئی ہے:

لا یؤمن احدکم حتی یکون اللہ و رسولہ احب الیہ من اھلہ و مالہ والناس اجمعین (متفق علیہ)	تم میں سے کسی کا ایمان معتبر نہیں ہے جب تک کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو اس کے اہل اور اس کے مال اور سارے لوگوں سے زیادہ محبوب

نہ ہو جائیں۔

بعض روایات میں "ومن نفسہ" کے الفاظ بھی آئے ہیں یعنی "اس کو اللہ اور رسولؐ اس کی اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز و محبوب نہ ہو جائیں۔"

عن انس قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ثلاث من کن فیہ وجد بھن حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھا وان یحب المرء لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یعود فی الکفر بعد اذ انقذہ اللہ منہ کما یکرہ ان یلقیٰ فی النار

حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت ہے: وہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تین چیزیں جس میں ہوں گی وہ ان سے ایمان کی حلاوت پائے گا۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسولؐ اس کو تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہوں۔ دوسری یہ کہ وہ کسی سے صرف اللہ کی خاطر محبت کرے۔ تیسری یہ کہ کفر سے نجات پا جانے کے بعد اس میں لوٹنے کو وہ آگ میں ڈالے جانے کی طرح مبغوض جانے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

بعض لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ کیا یہ ممکن بھی ہے کہ جو چیز انسان نے کبھی دیکھی نہ ہو اس سے اس کو محبت ہو اور محبت بھی ایسی کہ دوسری تمام چیزوں کی محبت سے بڑھ جائے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ صرف ممکن ہی نہیں بلکہ یہ واقعہ ہے کہ انسان خود اپنے وجود کے اندر جو محبت ایک ان دیکھی چیز سے کرتا ہے وہ ان چیزوں سے نہیں کرتا جن کو وہ رات دن دیکھتا ہی نہیں، بلکہ اپنی خدمت میں سرگرم بھی پاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں اور اس کے کان، آنکھ ہر وقت اس کی فرماں برداری میں منعد ہیں اور وہ ان کی فرماں برداری کا نہایت محتاج ہے، لیکن اس کے سامنے اگر یہ مطالبہ رکھا جائے کہ اسے اپنی تمام قوتوں اور صلاحیتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا اور بقیہ سے لازماً دست بردار ہونا ہے تو معقول انسان اپنی ظاہری قوتوں میں سے کسی ایک سے یا تمام سے دست بردار ہونا تو گوارا کرے گا لیکن وہ کسی قیمت پر بھی اپنی عقل سے دست بردار ہونا گوارا نہیں کرے گا اگرچہ اس نے اسے نہ کبھی دیکھا ہے، نہ چھوا ہے، نہ دیکھ اور چھو سکتا ہے۔

اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتی ہے کہ اگرچہ اس نے اس کو دیکھا نہیں، لیکن وہ جانتا ہے کہ اس کے اندر وہی جوہر لطیف ہے جس پر اس کے تمام شرف اور اس کی ساری عظمت کی بنیاد ہے۔ دوسری تمام قوتوں اور صلاحیتوں سے اگر وہ محروم ہو جائے تو اس سے اس کی اس

حیثیت عرفی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا جو بحیثیت انسان اس کو حاصل ہے لیکن عقل سے اگر وہ محروم ہو جائے تو دفعۃً وہ اشرف المخلوقات کے مرتبۂ بلند سے گر کر ارذل حیوانات کے درجہ میں آ جائے گا۔

یہی حال اس کائنات کی دوسری چیزوں کا بھی ہے۔ آسمان سے لے کر زمین تک لاکھوں کروڑوں چیزیں ہیں جن سے انسان شب و روز نفع اٹھا رہا ہے لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ یہ چیزیں اس کی نفع رسانی میں از خود نہیں لگی ہوئی ہیں، بلکہ ایک مخفی ذات نے، محض اپنے فضل و کرم سے ان کو اس کی خدمت میں لگا رکھا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ ان میں سے نہ کسی چیز کو اس نے پیدا کیا ہے، نہ پیدا کر سکتا ہے اور نہ ان کے پیدا کرنے والے پر اس کا کوئی حق ہی قائم ہے جس کی بنا پر وہ ان کی خدمت کا حقدار بن سکے۔ خاص طور پر جب یہ حقیقت اس پر واضح ہوتی ہے کہ دنیا میں جو محبوب سے محبوب چیز بھی اس کو حاصل ہے وہ اسی مخفی ذات کی بخشش سے حاصل ہے وہ جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے، کوئی دوسرا اس کو واپس نہیں دلا سکتا تو اس کا دل اس کی محبت سے اس طرح سرشار ہو جاتا ہے کہ ہر چیز اس کی محبت کے آگے ہیچ ہو جاتی ہے۔

پس یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ انسان خدا سے محبت نہیں کر سکتا۔ خدا مخفی ضرور ہے، لیکن اس کے مخفی ہونے کی مثال یوں ہے کہ گویا تل کے اوٹ میں پہاڑ ہو۔ آسمان اور زمین کے ہر گوشے اس کی منادی ہو رہی ہے۔ ابر اور ہوا سب اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ دریا اور پہاڑ، سب اس کے گواہ ہیں۔ پرندے اس کی حمد کے گانے گاتے اور درخت ان کے نغموں سے سرشار ہو کر جھوم رہے ہیں۔ اس دنیا کے ذرہ ذرہ پر اس کا نقش کندہ اور ایک ایک پتہ پر اس کی گواہی ثبت ہے۔ ایک ایسی ذات کو مخفی سمجھنا انسان کی اپنی عقل کا قصور ہے۔ اللہ تعالیٰ مخفی نہیں، بلکہ بدیہی ہے، بلکہ صحیح تر لفظوں میں یوں کہئے کہ ابدہ البدیہیات ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ انسان کو ایسے مغالطے پیش آ جاتے ہیں جن کے سبب سے وہ اس کی صحیح معرفت سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور جب تک ایک چیز کی معرفت حاصل نہ ہو اس سے معمولی محبت بھی کرنا ممکن نہیں چہ جائیکہ تمام چیزوں سے بڑھ کر۔ بس یہی محرومی آدمی کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم رکھتی ہے۔

خدا سے محبت کے لئے اس کی معرفت ضروری ہے

معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی راہ میں اصلی حجاب اس کا مخفی ہونا نہیں، بلکہ اس کی صحیح معرفت سے محروم ہونا ہے۔ اس محرومی کے باعث آدمی خدا کے متعلق طرح طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا

ہو جاتا ہے جو محبت تو در کنار سرے سے اس کا تعلق ہی خدا سے کاٹ دیتی ہیں۔

مثلاً بسا اوقات اس کو خدا کی قدرت اور اس کے علم کے باب میں غلط فہمی پیش آجاتی ہے جس کے سبب سے وہ یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اس عالم کا انتظام اس نے اپنے بہت سے مددگاروں میں تقسیم کر رکھا ہے اس وجہ سے صرف اسی کی عبادت کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ان شریکوں کی عبادت بھی ضروری ہے۔ پھر خاص طور پر ان شریکوں کی محبت وہ خدا سے بھی زیادہ کرتا ہے جن سے اس کے خیال میں خود اس کی اپنی ضرورتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ کبھی خدا کے عدل کے صحیح تصور سے محروم ہونے کے باعث یا تو اس بدگمانی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ خدا کے ہاں خیر و شر میں سرے سے کوئی امتیاز ہے ہی نہیں یا بعض ظاہر یا مخفی ہستیوں سے متعلق اس گمان میں پھنس جاتا ہے کہ وہ خدا کے ایسے مقرب اور چہیتے ہیں کہ وہ جس کے لئے چاہیں دنیا میں بھی اس کو خدا اپنے انعامات سے نوازے گا اور آخرت ہوئی تو اس میں بھی اس کو بخش دے گا، خواہ اس کے اعمال کچھ ہوں۔ چنانچہ وہ خدا کو چھوڑ کر اس کے ان مفروضہ مقربین ہی کی عبادت اور محبت کو اپنا دین بنا بیٹھتا ہے۔

اسی طرح بہت سے لوگ اس سنتِ الٰہی سے بے خبر ہوتے ہیں جس کے تحت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو دکھ یا سکھ دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ یا تو خدا سے ڈھیٹ اور بے پروا ہو جاتے ہیں یا مایوس اور دل شکستہ۔ مثلاً اللہ تعالیٰ بعض لوگوں پر اپنا فضل فرماتا ہے کہ دیکھے وہ اس فضل کو پا کر اس کے شکر گزار رہتے ہیں یا مغرور و متکبر بن کر اکڑنے اور اترانے لگتے ہیں۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے اس رمز سے واقف نہیں ہوتے وہ اس نوازش کو خدا کی طرف سے اپنی عزت افزائی سمجھ کر اکڑنے اور اترانے لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کے صبر کے امتحان کے لئے ان کو کسی آزمائش میں ڈالتا ہے۔ اگر وہ اس رمز سے واقف نہیں ہوتے تو وہ اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ خدا نے ان کو ذلیل کر دیا ہے جس کا اثر ان پر یہ پڑتا ہے کہ وہ خدا سے مایوس اور بدگمان ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح کی غلط فہمیاں ہیں جو بالآخر شرک کے دروازے کھولتی اور انسان کو شیطان کے جال میں پھنساتی ہیں۔ ان سے محفوظ رہنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان کو خدا کی صحیح معرفت حاصل ہو۔ ایسی معرفت کہ شیطان کو اس کے اندر گھسنے کی کوئی راہ نہ ملے۔ اگرچہ ایسی مکمل رخنہ بندی آسان نہیں ہے، لیکن خدا کی صحیح معرفت سے وہ لوگ اپنے کو شیطان کے حملوں سے بچا سکتے ہیں جو بچنا چاہیں۔ رہے وہ لوگ جو خود شیطان کے فتنوں میں پڑنا چاہتے ہیں تو ان کو اس کے جال سے کوئی بھی نہیں بچا سکتا۔

خدا کی معرفت سے ہماری مراد صوفیانہ معرفت نہیں ہے۔ صوفیانہ معرفت کی بے حقیقتی اس

کتاب کے پہلے حصہ میں ہم واضح کر چکے ہیں۔ بلکہ اس سے ہماری مراد وہ معرفت ہے جو اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی تعلیم سے حاصل ہوتی ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ محض ایک اجمالی تصور دینے کے لئے ہم بعض اصولی باتوں کی طرف اشارہ کریں گے۔

خدا کی معرفت کا سب سے زیادہ قطعی اور قابلِ اعتماد ذریعہ خدا کے وہ اسماء اور صفات ہیں جو اس نے خود اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی صفات کو خود ہی سب سے بہتر جانتا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو اپنی صفات کے معاملے میں دخل اندازی سے منع فرما دیا ہے:

فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ (النحل-۱۶ : ۷۴) (اللہ کے لئے اپنے جی سے مثلیں نہ بیان کرو)۔

ایک ماثور دعا میں بندے کی زبان سے خدا کی صفات کے باب میں یہ اعترافِ عجز نقل ہوا ہے:۔ لا احصی ثناء علیک - انت کما اثنیت علی نفسک (میں تیری ثنا کا حق ادا نہیں کر سکتا تو ویسا ہی ہے جیسی تو نے اپنی ثنا بیان فرمائی ہے) انسان اگر اپنے جی سے اللہ تعالیٰ کی صفتیں بیان کرے گا تو وہ اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق ایک مہادیو بنا کے رکھ دے گا اور پھر اپنے سارے دین کو اپنے اسی غلط تصور کے تحت اپنی خواہشوں کے سانچہ میں ڈھال لے گا۔ مذاہب کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے بارے میں تصور کی غلطی تمام بنیادی غلطیوں کا سبب ہوتی ہے، اس وجہ سے سب سے زیادہ ضروری خدا کی صفات کی سچی معرفت ہی ہے۔

اسی سے بندے کو خدا کی پسند اور ناپسند کا بنیادی علم ہوتا ہے۔ اسی سے وہ خدا کی قدرت، ربوبیت، رحمت اور حکمت کا تصور حاصل کرتا ہے جو اس کے ایمان، توکل، صبر اور رضا کی بنیادیں استوار کرتا اور جہادِ زندگانی میں اس کے لئے عزم اور قوت فراہم کرتا ہے۔ اسی سے اس کے اندر خدا کی وہ خشیت پیدا ہوتی ہے کہ وہ تنہائی کے گوشوں میں بیٹھا ہوا بھی یقین رکھتا ہے کہ اگرچہ وہ خدا کو نہیں دیکھ رہا ہے، لیکن خدا اس کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ یہی چیز اس کو توحیدِ حقیقی کا یہ شعور دیتی ہے کہ جو چیز اس کو خدا دینے والا نہیں ہے اس کو کوئی دوسرا اس کو دینے والا نہیں بن سکتا اور جو چیز اس کے رب نے اس کے لئے مقدر کر رکھی ہے آسمانوں اور زمین میں کسی کی قدرت نہیں کہ اس سے اسے محروم کر سکے۔ اسی سے اس کو یہ رہنمائی ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ اپنے بندوں کے ساتھ تمام تر اس کے عدل، علم اور رحم پر مبنی ہے۔ کوئی دوسرا اس میں اس کے اذن کے بدون زبان نہیں کھول سکتا۔ پھر سب سے زیادہ اہم بات تزکیہ کے پہلو سے یہ ہے کہ خدا کی صفات ہی کے آئینہ کے سامنے کھڑا ہو کر وہ صحیح صحیح اندازہ کرتا ہے کہ کیا چیزیں اس کے اندر موجود نہیں

ہیں جن کا ہونا ضروری ہے اور کیا چیزیں اس کے اندر ایسی ابھر آئی ہیں جو اس کے خالق کی پسند کے خلاف ہیں۔

یہ حقیقت یہاں یاد رکھیئے کہ تمام علم اور تمام شریعت کی بنیاد درحقیقت اللہ تعالیٰ کی صفات اور ان کے مقتضیات ہی پر ہے۔ انہی کی معرفت سے صحیح علم و معرفت کی راہیں کھلتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا راستہ

اب اس سوال پر غور کیجئے کہ خدا کی معرفت حاصل کرنے کا صحیح راستہ کیا ہے؟ اس سوال پر ہمارے علماء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں اس پر بڑی جامع اور مطالعہ کے قابل بحث لکھی ہے۔ حضرات صوفیاء سے بھی اس باب میں بے شمار اقوال منقول ہیں، لیکن ہمارے نزدیک اس پر سب سے دل نشین بحث امام ابن قیم علیہ الرحمۃ نے اپنی بے مثال تصنیف "مدارج السالکین" میں کی ہے۔ انہوں نے اس کے لئے جو طریقہ بتایا ہے ہمارے نزدیک اس کی بنیاد کتاب و سنت اور عقل و فطرت پر ہے، اس وجہ سے ان کی بحث کا خلاصہ یہاں ہم اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے محبتِ الٰہی کے حصول کے لئے مندرجہ ذیل دس باتیں اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

۱ - قرآن مجید کا مطالعہ پورے غور و تدبر کے ساتھ اس طرح کہ اس کے معانی و حقائق تک رسائی حاصل ہو۔

۲ - فرائض کے ساتھ ساتھ نوافل کا اہتمام تاکہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہو۔ یہ چیز آدمی کو درجہ بدرجہ خدا کی محبت سے اس کی محبوبیت کے درجہ تک پہنچاتی ہے۔

۳ - ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے ذکر کا اہتمام۔ یہ ذکر زبان، دل، عمل اور حال ہر چیز سے ہو۔ اس میں جتنی ہی سرگرمی ہوگی اسی کے بقدر محبتِ الٰہی میں آدمی کا حصہ ہوگا۔

۴ - اس امر کی کوشش کہ جب نفس کی خواہشیں زور لگائیں تو آدمی اپنی پسند کو چھوڑ کر خدا کی پسند کو اختیار کرے۔ یہ چڑھائی اس کو کتنی ہی ہمت آزما نظر آئے لیکن وہ ہمت نہ ہارے۔

۵ - دل اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کے مطالعہ، ان کے اسرار و حقائق کے مشاہدہ اور ان کی معرفت کے چمنستانوں کی سیر میں برابر لگا رہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کو اس کے اسماء و صفات اور اس کے افعال کی راہ سے پہچانے گا وہ لازماً اس سے محبت بھی کرے گا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی صفات کے منکر ہیں ان کے لئے اس کی محبت میں کوئی حصہ نہیں۔

۶ - برابر اللہ تعالیٰ کے افضال و احسانات، اس کی شانوں اور کرشموں اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں پر نگاہ رکھے۔ یہ چیز خاص طور پر اس کی محبت پیدا کرنے والی ہے۔

۷ - اور ان سب سے بالاتر شان رکھنے والی چیز رب کے سامنے بندے کے دل کا کامل انکسار ہے، جس کی حقیقت کی تعبیر الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔

۸ - جو اوقات اللہ تعالیٰ کے سماءِ دنیا پر نزول کے ہیں ان میں اس سے مناجات، اس کے کلام کی تلاوت، آدابِ عبودیت کے ساتھ اس کے حضور میں حاضری کا اہتمام اور آخر میں استغفار اور توبہ پر اس کا اختتام۔

۹ - اللہ تعالیٰ کے صادق محبوں کی ہم نشینی، ان کے پاکیزہ ارشادات کی خوشہ چینی اور اس امر کا اہتمام کہ اس وقت تک زبان سے کوئی کلمہ نہ نکالے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے کہ اب بات کہنے ہی میں اپنے حال کی اصلاح اور دوسروں کی مصلحت ہے۔

۱۰ - ان تمام چیزوں سے کلی احتراز جو آدمی کے دل اور اس کے رب کے درمیان حائل ہونے والی ہیں۔

اس بحث کو ختم کرتے ہوئے امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ یہ راستہ ہے جس کو اختیار کر کے طالبینِ حق نے اللہ تعالیٰ کی محبت اور محبوبیت کا مقام پایا ہے۔ ہمارے نزدیک ان کا یہ ارشاد صدفی صد حق ہے۔ یہی راستہ کتاب و سنت کا بتایا ہوا راستہ ہے۔

محبتِ الٰہی کے حصول کا عملی راستہ

یہ راستہ جو بیان ہوا یہ علمی راستہ ہے۔ قرآن مجید نے اس کا ایک عملی طریقہ بھی بتایا ہے جو ایک معین اور محسوس شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے اور جس کو وہ لوگ بھی اختیار کر سکتے ہیں جو زیادہ علمی کاوشوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ راستہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل اتباع کا راستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے وجودِ گرامی کو دنیا میں اپنے کامل محب اور اپنے کامل محبوب کے ایک پیکرِ قدسی کی شکل میں مبعوث فرمایا تاکہ لوگ ایک چلتی پھرتی اور تمام نشیب و فراز سے گزرتی ہوئی زندگی میں دیکھ لیں کہ اللہ کے محب اور اس کے محبوب کی زندگی کیا ہوتی ہے اور وہ اپنے گھر میں اور گھر سے باہر لوگوں کے اندر اپنے شب و روز کس طرح گزارتا ہے؟ ظاہر ہے کہ محبت اور محبوبیت جیسے نازک مسئلہ کو سمجھانے کے لئے سب سے زیادہ سہل راستہ یہی ہو سکتا ہے کہ ایک چلتی پھرتی زندگی میں اس کو لوگوں کے سامنے متشکل کر دیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی کیا جس کا ذکر سورۃ آل عمران میں یوں ہوا ہے:

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (آل عمران ۳:۳۱)	ان سے کہہ دو کہ اگر تم اللہ سے محبت کرنے کے مدعی ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

یہ امر یہاں ملحوظ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم محبت اور محبوبیت، دونوں کے کامل نمونہ ہیں۔ یہ شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ زندگی کے کسی شعبہ میں بھی محبت یا محبوبیت کا کوئی ایسا نمونہ بھی ہو سکتا ہے جو حضورؐ کے نمونہ سے اعلیٰ ہو۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشادات پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ جب کبھی کسی نے زندگی کے کسی معاملہ میں اس حد سے آگے قدم بڑھانے کی کوشش کی جو حضورؐ کی مقرر کردہ حد سے ذرا بھی متجاوز تھی تو آپ نے یہ کہہ کر اس کو روک دیا کہ میں اللہ سے تمہاری نسبت زیادہ محبت کرنے والا اور زیادہ ڈرنے والا ہوں، تو جب میں ایک کام کرتا ہوں تو تم اس کو تقویٰ کے خلاف کیوں سمجھو!

ایک تنبیہ

یہ امر نگاہ میں رہے کہ میں نے لفظ محبت استعمال کیا ہے، عشق یا اس قسم کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے قرآن اور حدیث دونوں میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے، کہیں عشق کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ وہ یہ کہ لفظ عشق ایک غیر متوازن کیفیت پر دلیل ہوتا ہے اس وجہ سے اللہ اور رسولؐ کے لئے اس کا استعمال نہ صرف ناموزوں ہے، بلکہ اس میں احتمال سوءِ ادب کا بھی ہے۔ اللہ و رسولؐ کے ساتھ بندوں کے سارے معاملات حدودِ شریعت کے پابند ہیں۔ اگر بال برابر بھی ان سے تجاوز ہو جائے تو گو یہ تجاوز جذبۂ عشق کی تحریک ہی سے ہو لیکن اس سے بدعت اور ضلالت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ لفظ عشق کا استعمال زیادہ تر شاعروں نے کیا ہے یا صوفیوں نے۔ شاعروں کا معاملہ یہ ہے کہ وہ جب تک ہر چیز کو لیلیٰ اور مجنوں کی حکایت نہ بنا لیں ان کی شاعری بے مزا رہتی ہے اس وجہ سے وہ چاہے روزہ اور نماز سے کوئی تعلق نہ رکھتے ہوں لیکن وہ اللہ سے بھی عشق رکھتے ہیں اور اس کے رسول سے بھی۔ ان کے ہاں ہر نعت گو اور ہر قوال عاشقِ رسولؐ ہوتا ہے۔ صوفیوں کا معاملہ یہ ہے کہ انہوں نے ہر میدان میں جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے پہلے حصہ میں واضح کیا ہے، اپنا گول اصحابِ شریعت سے آگے باندھنے کی کوشش کی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے محبت کے عام اور معروف لفظ کو اپنے جذبۂ محبت

کی تعبیر سے قاصر پایا اور اس کی جگہ لفظ عشق کو اختیار کیا جو ان کے ہاں اصل محبوب لفظ ہے۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک نزاعِ لفظی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس عشق نے تصوف میں جو بدعتیں داخل کی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔

محبت، عشق کی طرح، کوئی مبہم، مجہول اور بے قید چیز نہیں ہے۔ بلکہ ایک معروف، معین اور پابندِ آئین چیز ہے۔ یہ ایک جانی پہچانی کسوٹی ہے جس پر آدمی اپنے کو بھی اور دوسروں کو بھی پرکھ کر دیکھ سکتا ہے کہ کس کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہے اور کون اللہ تعالیٰ کے بالمقابل دوسری چیزوں سے زیادہ محبت رکھتا ہے اور کون اللہ تعالیٰ کے بالمقابل دوسری چیزوں سے زیادہ محبت رکھتا ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی کے سامنے جب کوئی ایسا موڑ آئے جب اسے یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ دو راستوں میں سے وہ کون سا راستہ اختیار کرے: وہ راستہ جو اس کی خواہشوں، اس کی حاضر مصلحتوں، اس کے عزیزوں اور دوستوں کی رائے اور پسند کے موافق ہے لیکن اس کے اپنے علم کے حد تک وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف ہے۔ یا وہ راستہ جو اگرچہ ان سب کی رائے کے خلاف ہے جن کی دلداری اس کو عزیز ہے لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی شریعت کے موافق ہے؟ اس صورت میں اگر وہ اپنی خواہشوں اور اپنے ہواخواہوں کی پاسداری کو ترجیح دے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خدا سے زیادہ دوسروں سے محبت کرتا ہے اور اللہ پر ایمان کا دعویٰ محض ادعا ہے اور اگر وہ دوسری راہ پسند کرتا ہے یعنی سب کو نظر انداز کر کے بے دھڑک اللہ کے حکم کو اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کا سچا محب بھی ہے اور سچا محبوب بھی اگرچہ اس نے عشقِ الٰہی کا کبھی دعویٰ نہ کیا ہو۔

یہ محبت ہے جس کا دین میں اعتبار اور جس پر آدمی کے اُخروی مراتب کا انحصار ہے۔ اس کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے خود قرآن نے ایک واضح کسوٹی بھی مقرر کر دی ہے جس پر ہر مدعی کو آپ جب چاہیں جانچ سکتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے زعم میں، محبت کے زیر اثر، گریباں اور دامن چاک کر کے برہنہ سر اور برہنہ پا گھروں سے نکل کھڑے ہوتے اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں تو ان کی محبت کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی کسوٹی نہیں ہے اور یہ کہنا بھی ہمارے لئے مشکل ہے کہ فی الواقع یہ عشقِ الٰہی ہے یا عشقِ لیلیٰ ہے یا محض خللِ دماغ ہے۔

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

انسان کا امتحان اور مسئولیت

سوال :۔ خداوند تعالیٰ نے ہمیں پیدا کیا تو اس میں ہماری مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ ہمارے مزاج کی ساخت بھی اسی کی مرضی کے مطابق ہے۔ اس طرح کی زندگی پر مسئولیت خدا نے بہت بڑی رکھی ہے۔ کیا یہ ایک یک طرفہ معاہدہ نہیں ہے کہ جس میں دوسرا فریق محض مجبورانہ شریک ہے ؟

جواب :۔ اکثر شاعروں نے اس خیال کو ہوا دی ہے لیکن واقعہ یہ نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بہت معمولی امتحان کے بدلے میں جنت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتیں رکھ دی ہیں۔ دنیا کے اس امتحان کے نتیجے میں، اللہ تعالیٰ انسان کو جو کچھ بنانا چاہتا ہے اور اسے جس مقامِ عالی کے حصول کا موقع فراہم کرتا ہے اس سے بڑا مقام صرف خداوند تعالیٰ ہی کا رہ جاتا ہے اور کسی کا نہیں۔ خداوند تعالیٰ کی بڑائی تو ازلی و ابدی ہے لیکن اس نے انسان کو بھی اپنے قریب لا کھڑا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے لئے اس سے بڑے کسی مرتبہ کا تصور ناممکن ہے۔ قرآن مجید میں اس کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

لَهُمْ فِيهَا مَا يَشَاءُونَ خَالِدِينَ ۚ كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ وَعْدًا مَسْئُولًا ○

(الفرقان - ۲۵ : ۱۶)

اس میں ان کے لئے وہ سب کچھ ہو گا جو وہ چاہیں گے، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ تیرے رب کا وعدہ ہے جس کے ایفا کی اس پر حتمی ذمہ داری ہے۔

لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ

(ق - ۵۰ : ۳۵)

ان کو ملے گا جو وہ چاہیں گے اور ہمارے پاس اس سے زیادہ بھی ہو گا۔

ایک ایسا مقام حاصل ہو جانا جس میں ہر وہ چیز حاصل ہو جس کی بندہ خواہش کرے اور مزید برآں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خصوصی نوازشات ہوں کوئی معمولی کامیابی نہیں ہے۔ بعض بے ہودہ شاعروں نے جنت کی چیزوں کی تحقیر کر کے ان کی وقعت گھٹانے کی کوشش کی ہے اور لوگوں کو یہ سبق دیا ہے کہ وہ آخرت کے ادھار کے لئے دنیا کے نقد کو نہ چھوڑیں۔ یہ ایک باطل سبق ہے جو انسان کو اس عظیم بادشاہی سے محروم کرتا ہے جو چند روزہ زندگی کے امتحان میں سرخرو ہونے پر جنت میں اسے ملنے والی ہے۔

اب اس امتحان کی نوعیت پر غور کیجئے جس سے انسان کو سابقہ ہے۔ اس میں بعض ان دیکھی حقیقتوں کو جن کے شواہد سے کائنات بھری ہوئی ہے مان لینے کا مطالبہ ہے اور اچھی فطرت کے تقاضوں پر

عمل کے لئے کہا گیا ہے۔ یہ امتحان ایسا نہیں جس کے بار گراں کے آپ متحمل نہیں ہو سکتے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر نصب العین کی قدر و قیمت واضح ہو تو پھر دنیا کی کوئی رغبت اور طمع اتنی طاقت ور نہیں کہ وہ ایک صاحبِ عزم کو اس کے نصب العین سے پھیر سکے۔ تاریخ میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً اس راہ میں سخت سے سخت امتحان یہ پیش آ سکتا ہے کہ زہر کا پیالہ پینا پڑے۔ تو دنیا میں سقراط ایسے انسان پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ایک مقصد کے لئے زہر کا پیالہ بھی پی کے دکھا دیا۔ اس میں زیادہ سے زیادہ قربانی یہ پیش آ سکتی ہے کہ سلطنت سے ہاتھ دھونا پڑے۔ تو گوتم بدھ نے سلطنت پر لات مار کے دکھا دیا ہے کہ ایک نصب العین کی خاطر یہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں انسان کا سب سے بڑا مقابلہ بہرحال شیطان سے رہتا ہے تو معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایسے انسان بھی دنیا میں پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے شیطان کو اس طریقے سے پچھاڑا ہے کہ وہ اس رستہ کو چھوڑ دیتا تھا جس رستے سے وہ گزرتے تھے! اس کے باوجود مجھے تسلیم ہے کہ دنیا کا امتحان بہرحال سخت ہے لیکن یہ صرف بزدل کے لئے سخت ہے بہادروں کے لئے ہرگز سخت نہیں۔ یہ صرف اسی شخص کے لئے سخت ہے جس کے آگے ابدی زندگی کا صحیح تصور نہیں ہے۔

لہٰذا اس معاہدے کو جو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندے کے درمیان ہے میں یک طرفہ نہیں سمجھتا۔ بلکہ یہ سمجھتا ہوں کہ ایک بادشاہ نے ابدی زندگی کی سرفرازی کے لئے گویا ہمارے لئے ایک بہانہ پیدا کیا ہے کہ ایک معمولی امتحان میں کامیاب ہو کر آسمان و زمین کی سلطنت حاصل کرنے کا اپنے آپ کو مستحق بنا لیں۔ میرے نزدیک، اس معاہدہ میں انسان کی شرکت کوئی مظلومانہ شرکت نہیں ہے، بلکہ بڑی فاتحانہ شرکت ہے۔ ہم ایک عظیم معاہدے میں بغیر کسی استحقاق اور زحمت کے ایک پارٹی بنائے گئے ہیں اور یہ پارٹی بننا ہمارے لئے عزت افزائی کا باعث ہے۔ اس میں ہمارا کوئی نقصان نہیں بلکہ سراسر فائدہ ہے لہٰذا اس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیئے، بلکہ اس کے لئے حوصلہ مند ہونا چاہیئے۔ اس لئے کہ دنیا کی بڑی سے بڑی چیز بھی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لئے قربان کی جا سکتی ہے اور اس معاہدہ میں سرخرو ہونا بالکل انسان کی قدرت کے دائرہ میں ہے۔

دنیا کے خزف ریزوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ خداوند تعالیٰ کا قرب اصل بادشاہی ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے ایک ایک لمحے کو اس کے قرب کا ذریعہ بنائے۔ معمولی معمولی لوگوں کے قرب کے لئے لوگ نہ جانے کیا کیا قربانیاں دیتے ہیں۔ ایمان، اخلاص، دین، خاندان، حسب نسب، سب کچھ غارت کر دیتے ہیں۔ خداوند تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا تو بہرحال کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنے طرزِ عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے بارے میں جو حسن ظن رکھا تھا ہم واقعی اس کا مصداق ہیں۔

رسولؐ وسیلہ ہیں

سوال : قرآن حکیم میں حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف وسیلہ ڈھونڈو۔ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے وسیلہ ہو سکتے ہیں ؟

جواب : اللہ تعالیٰ نے جہاں اپنی طرف وسیلہ ڈھونڈنے کا حکم دیا ہے وہیں یہ بھی نہایت واضح طور پر بتا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے وسیلہ ہے کیا ؟

وسیلہ کے معنی وہی ہیں جو "حبل اللہ" کے ہیں۔ یعنی اللہ کی رسی اور اس کی طرف ذریعہ اور واسطہ۔ وحبل اللہ قرآن مجید کو کہا گیا ہے جو ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان وسیلہ ہے۔ یہی وہ رسی ہے جو ایک طرف خدا کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف ہمارے ہاتھ میں۔ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس وقت تک تعلق ہے جب تک قرآن مجید کے ساتھ ہماری وابستگی قائم ہے۔ یہ وابستگی ختم ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق بھی ختم ہو جائے گا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ رسی ہمارے ہاتھ میں تھمائی ہے۔ آپ نے ہمیں یہ قرآن مجید بخشا ہے تو آپ بھی اسی "حبل اللہ" کا ایک حصہ ہیں، اس سے الگ کوئی چیز نہیں ہیں۔ لہٰذا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا وسیلہ ڈھونڈنا کسی غیر کا وسیلہ ڈھونڈنا نہیں ہے۔ یہ تو بعینہٖ وہی وسیلہ ہے جو قرآن مجید خود ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر آپ غیر اللہ کہیں تو قرآن بھی تو غیر اللہ ہے۔ لیکن چونکہ ان کے وسیلہ ہونے کی حیثیت خود اللہ تعالیٰ نے قائم کی ہے اس لئے یہ اس معنی میں وغیر اللہ نہیں ہیں جس سے اجتناب کا ہمیں حکم ہے۔

اب یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کی رسی کو تو آپ چھوڑ دیں اور اس کے بعد کوئی سی بھی رسی جسے آپ اس کی جگہ پکڑ لیں وہ وسیلہ بن جائے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ رسی کے بجائے آپ نے سانپ پکڑ لیا ہو۔ لہٰذا اور کسی کو وسیلہ ڈھونڈنا جائز نہیں۔

نبی صلعم کے ساتھ ہمارے تعلق کی جو بنیادیں ہیں وہ بہت وضاحت کے ساتھ قرآن مجید نے بیان کر دی ہیں یعنی ایمان، اطاعت، اتباع اور محبت۔ آپ ہمارے لئے ہدایت کا وسیلہ ہیں، قرآن دینے کا واسطہ ہیں، آپ کی سنت کا اتباع ہمارے لئے نجات کا ذریعہ ہے۔ صرف آپ کے طریقہ پر چل کر ہم خدا کے محبوب اور محب بن سکتے ہیں لہٰذا آپؐ کے ساتھ ہمارا معاملہ انہی بنیادوں پر ہونا

چاہیے جو اللہ تعالیٰ نے متعین کر دی ہیں۔ اس سے ہٹ کر کوئی معاملہ کرنا ایک بدعت ہوگا جو مسلمانوں کو دین کے راستہ سے ہٹانے کی ایک شیطانی تدبیر ہے۔

غیر مسلم کی نیکی کا معاملہ

سوال : ایک غیر مسلم کوئی نیکی کرتا ہے تو اس کا معاملہ کیا ہوگا ؟

جواب : نیکی کی ٹھیک ٹھیک نوعیت جاننے کے لئے یہ بنیادی حقیقت ہمیشہ ذہن نشین رہنی چاہیے کہ صرف وہ کام جو خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے کیے جاتے ہیں وہ نیکی کے کام ہوتے ہیں۔ جن کاموں کی انجام دہی کے وقت اللہ تعالیٰ کی رضا کو کوئی دخل نہ ہو تو وہ دنیا کے کام ہیں۔ ان کے لیے اللہ تعالیٰ سے صلہ نہیں چاہا جا سکتا۔ اعمال کے صلے کا انحصار ان اعمال کے محرک پر ہے۔ جتنے بھی کام کسی غیر اللہ کو خوش کرنے کے لئے کیے جاتے ہیں، مثلاً ایک شخص انسانیت کے نام پر کوئی نیکی کرتا ہے یا ایک غیر مسلم اپنے بت پرستانہ تصورات کے تحت کوئی نیکی کرتا یا پُن کا کام کرتا ہے تو ان کے محرکات وہ نہیں ہوتے جو خدا کی رضا کے لئے نیکی کرنے والے شخص کے ہوتے ہیں۔ ایسے اعمال کا صلہ خدا سے چاہنے کی کوئی بنیاد نہیں۔

اسلام میں نیکی کا محرک صرف خداوند تعالیٰ ہے۔ خدا کسی کا ممنون یا محتاج نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا: "اے یہودیو! کیوں ناز کرتے ہو کہ ابراہیمؑ کی اولاد ہو۔ میرا رب چاہے تو ان کنکروں پتھروں سے ابراہیمؑ کی اولاد پیدا کر سکتا ہے۔" اللہ تعالیٰ بڑے سے بڑا خادم دین، بڑے سے بڑا لیڈر، مصلح، ریفارمر جہاں سے چاہے اور جب چاہے پیدا کر سکتا ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے کہ بندہ جس شکل میں بھی کوئی عمل کرے تو وہ خوش ہو جائے کہ شاباش تو نے یہ عمل تو کیا۔ وہ تو وہی نیکی قبول کرتا ہے جو اس کی بتائی ہوئی شرائط پر کی گئی ہو نہ کہ بندے کی اپنی شرائط پر۔ چنانچہ وہ صلہ بھی انہی نیکیوں کا دے گا جو اس کی شرائط پر پوری اتریں گی جو اس کے حکم کے مطابق اور صرف اس کی رضا جوئی کے لئے کی گئی ہوں۔ جو نیکیاں دوسروں کے لئے کی گئی ہوں ان کا صلہ بھی انہی سے چاہا جا سکتا ہے جن کے لئے وہ کی گئی تھیں۔

ترتیب : ساجد خاور

بقیہ : فہم قرآن کے چند بنیادی اصول

کے قرآن کلام میں پہلے سے موجود ہونے چاہئیں۔ اگر چوری پر قطع ید کی سزا احادیث میں خاص خاص نوعیت کے افراد یا ایک خاص مقدار سے کم مقدار میں چوری کرنے والوں کو مستثنیٰ کیا گیا ہے تو اس کے قرائن اس آیت میں بھی اور دوسرے مقامات میں بھی پہلے سے موجود ہیں۔ بلکہ عام عقل کا بھی فیصلہ ہے کہ ہر گری پڑی چیز کو اٹھا لینے والا وہ چور نہیں جس پر "السارق" اور "السارقہ" کا اطلاق ہو اور اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے۔

امام شافعیؒ کے ہاں بھی مخصص کے لئے ضروری ہے کہ اس کے قرائن پہلے سے موجود ہوں ورنہ اس کی حیثیت ناسخ کی ہوگی اور قرآن کا ناسخ صرف قرآن ہی ہو سکتا ہے کوئی دوسری چیز نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید میں جتنے بھی ناسخ اور جتنے بھی منسوخ ہیں وہ سب کے سب اس میں موجود ہیں اور یہی عقل کا تقاضا ہے۔ جب قرآن مجید کو قرآن مجید ہی منسوخ کر سکتا ہے تو یہ ضروری ہوا کہ اگر کسی چیز کو ہم کہتے ہیں کہ منسوخ ہے تو اس کے ناسخ کا بھی پتہ دیں کہ فلاں آیت اس کی ناسخ ہے۔ اگر ناسخ کا پتہ نہ دیا جاسکے تو کس دلیل کی بنا پر کسی چیز کو منسوخ قرار دیا جاسکے گا اور کوئی شخص اس کو باور کیوں کرے گا؟

ترتیب : عبداللہ غلام احمد

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو نایاب معرکۃ الآرا تصانیف کے جدید ایڈیشن

الحمد للہ شائع ہو گئے ہیں

اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل
قیمت : ۱۲/۰ روپے

قرآن میں پردے کے احکام
قیمت : ۲/- روپے

ناشر: **فاران فاؤنڈیشن ۱۲۲ فیروزپور روڈ، لاہور ۱۶**